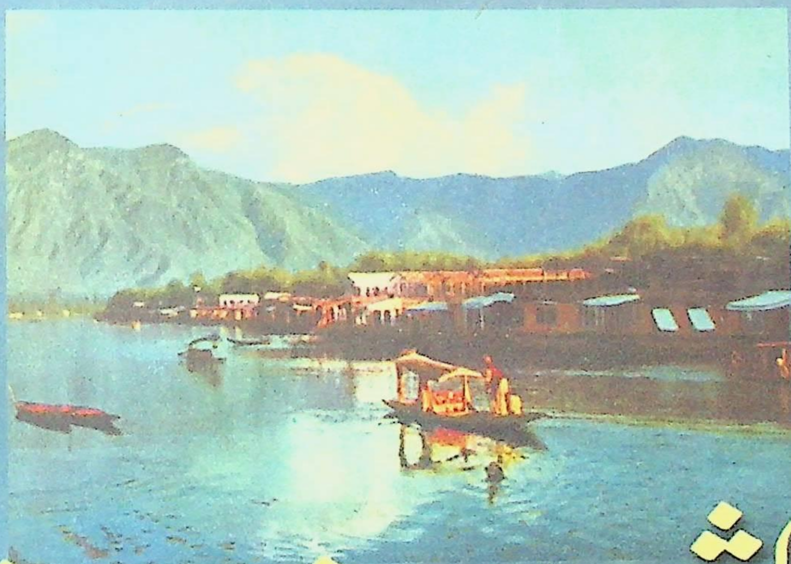


کشمیری افسانے

مرتبہ

محمد زمان آزردہ

اُردو ترجمہ

بشیر اختر

کشمیری افسانے

ہندوستانی کتابوں کا سلسلہ

کشمیری افسانے

مرتبہ

محمد زمان آزردہ

اردو ترجمہ

بشیر اختر



نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

ISBN 81-237-4176-

لا اردو ایڈیشن :2004 (ساکا 1925)

متعلقہ قلمکار

برائے اُردو ترجمہ: نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

Anthology of Kashmiri Short Stories (Urd

ت: 70.00

ر: ڈائریکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

A گرین پارک، نئی دہلی۔ 110016

فہرست

محمد زمان آزردہ

کشمیری افسانے کا مختصر جائزہ

عالمی ادب میں افسانہ انیسویں صدی کے وسط میں ظہور پذیر ہوا اور بیسویں صدی کے اوائل میں پوری طرح منظر عام پر آگیا۔ دنیا کی دیگر اہم زبانوں کی طرح کشمیری زبان میں بھی داستان اور لوک کہانیوں کی روایات ازمنۂ قدیم ہی سے چلی آرہی ہیں۔ لیکن افسانہ لکھنے کا رواج بیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوا۔ کشمیری میں افسانہ لکھنے کا آغاز 1950ء میں اشتراکی انقلاب کے زیر اثر ہوا، جب کشمیری میں کلچرل کانگریس نامی ادبی تنظیم وجود میں آئی۔ اصل میں یہ صنف اردو زبان کے ادیبوں کی کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔ یہ ادیب اس زمانے میں پورے برصغیر میں اشتراکی انقلاب کے حامی تھے۔ چنانچہ کلچرل کانگریس کی طرف سے بلائی گئی ایک ادبی نشست میں سوم ناتھ زتشی نے اپنا پہلا کشمیری افسانہ "جب پو پھٹی" 25 فروری 1950ء کو پڑھا اور اسی کے آس پاس دینا ناتھ نادم کا افسانہ "جوابی کارڈ" لونگ پوش نامی رسالے میں شائع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری ادیب اب تک اسی بات پر متفق نہیں ہو سکے ہیں کہ پہلا کشمیری افسانہ "جب پو پھٹی" کو قرار دیا جائے یا "جوابی کارڈ" کو۔ چنانچہ یہ بحث اب بھی جاری ہے۔ اس کے بہت دن بعد اختر محی الدین نے افسانے کو اپنا ذریعۂ اظہار بنالیا اور کشمیری افسانے کو فنی لحاظ سے ایک نیا موڑ دیا۔ اختر محی الدین کا پہلا افسانوی مجموعہ "ست سنگر" (سات چوٹیاں) 1957ء میں منظر عام پر آگیا۔ انہیں اس مجموعے پر ساہتیہ اکادمی کی طرف سے ایوارڈ بھی ملا ہے۔ غرض ابتدائی دور میں زتشی اور نادم کے علاوہ نور محمد روشن، عزیز ہارون، اختر محی الدین، علی محمد لون، صوفی غلام محمد اور اُمیش کول کشمیری افسانے کے آبیاری اپنے حساب سے کرتے گئے اور بعد میں امین کامل بھی اس کارواں میں شامل ہوئے۔

1950ء کے بعد اور بھی کئی نامور ادیب اس صنف کی آبیاری کرتے رہے۔ جن میں بنسی نردوش، اوتار کرشن رہبر، رتن لال شانت، دیپک کول، غلام رسول سنتوشی، شنکر رینہ، ہردے کول بھارتی، عباس تابش اور غلام نبی بابا بھی شامل ہیں۔

ان کے بعد اس کارواں میں ہری کرشن کول، تاج بیگم رینزو، فاروق مسعودی، بشیر اختر،

شمس الدین، انیس ہمدانی، یعقوب دلکش، محمد زمان آزردہ اور جی۔ ایم آزاد وغیرہ شامل ہوئے۔

کشمیری افسانے کا سفر اگرچہ اشتراکی انقلاب کے زیر اثر شروع ہوا تھا، لیکن کشمیری مزاج، تہذیبی اقدار اور سماجی رکھ رکھاؤ کے تحت یہاں کے افسانے نے مانگے کا چولا جلد ہی اتار پھینکا اور اختر محی الدین نے پہلی بار اس کو خالص کشمیری ملبوسات میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اختر اور کامل کے فن پاروں میں جو کردار پیش کیے گئے وہ خالص کشمیری کردار تھے۔ جو اَن پڑھ تھے اور دنیا کے کسی بھی فلسفے سے جن کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کی دنیا حقیقی دنیا تھی کہ جس میں وہ خود رہ رہے تھے اور جس کا انہیں تجربہ تھا۔

ان ہی دنوں کشمیری افسانہ نگار انگریزی افسانے سے اپنے آپ کو متعارف کرنے لگے۔ دنیا کی دیگر بڑی زبانوں کے افسانے بھی انہوں نے انگریزی زبان ہی کی وساطت سے پڑھے۔ چنانچہ وہ جان گئے کہ محض اشتراکیت ہی زندگی کا لب لباب نہیں، روٹی کپڑا اور مکان کے علاوہ بھی کئی اور ضروریات ہیں کہ جن کی ہر آدمی کو تلاش ہے۔ اور اسی بات کا جواب اسے ہمارے افسانہ پڑھ کر مل جائے تو اچھا ہے۔ الغرض موضوع کے لحاظ سے کشمیری افسانے کئی منازل طے کر گیا ہے۔

افسانہ نگاروں کی تیسری کھیپ جو 1970ء کے بعد وجود میں آئی جو عصری حسیت اور آگہی کے زیر اثر کشمیری افسانے کی آبیاری کرتی رہی۔ ان میں اختر اور بھارتی کے ساتھ ساتھ بشیر اختر، گلشن مجید، نذیر جہانگیر، انیس ہمدانی، یعقوب دلکش اور رشید مجروح کے یہاں افسانے کی نئی جہتوں کا پتہ چلتا ہے۔ جی۔ ایم آزاد اور انیس ہمدانی جیسے جواں مرگ افسانہ نگاروں سے کشمیری قاری کی کئی ایک توقعات وابستہ تھیں لیکن افسوس کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔

اس مجموعے میں زیادہ کہانیاں شائع کرنے کی گنجائش نہ تھی، لیکن اُمید ہے کہ اس مجموعے کے بعد بھی کئی اور مجموعے شائع ہوتے رہیں گے۔ ہم شنکر رینہ اور دوسرے کئی افسانہ نگاروں کے فن پارے اس مجموعے میں شامل نہ کر سکے کیونکہ کوششوں کے باوجود بھی ہم ان کے اجازت نامے حاصل نہ کر سکے۔ ممکن ہے کہ اس مختصر جائزے میں کئی اہم نام شامل ہونے سے رہ گئے ہوں یا کوئی نام حسب ترتیب درج نہ ہوا ہو۔ ہمیں امید ہے یہ بھول محض بھول سمجھی جائے گی کیونکہ ہماری نیت کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ مجموعے میں افسانہ نگاروں کے نام ان کے ادبی مراتب یا عمر کے لحاظ سے نہیں بلکہ نام حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دئے گئے ہیں۔

اختر محی الدین

مترجم: بشیر اختر

ہُو کا عالم

"ہے۔ چوزہ مر گیا ہے!! یہ وہ بولا۔

"مر تو گیا ہے۔ پر بات کیا بنی؟" یہ میں نے خیال کیا، لیکن کیا کچھ بھی نہیں۔

"سُن لیا تم نے" وہ پھر ایک بار چلا اُٹھا۔ "چوزہ مر گیا ہے"۔

اب تو میں ایک نظر اُس کے سر پیر کا جائزہ لینے لگا تھا۔ خاصا بھلا آدمی تھا، اچھے کپڑے زیب تن کئے۔ اُس کے سراپا کو دیکھ کر مجھے اُس کے اندر دیوانگی کے کوئی بھی آثار نظر نہ آئے۔ البتہ اُس کے بکھرے بال، حلقوں سے باہر آتی اُس کی سرخ آنکھیں، دائیں ہاتھ میں کالے رنگ کا مرا ہوا چوزہ اُٹھائے وہ کبھی مجھے گھورنے لگتا تھا اور کبھی چوزے کو دیکھتا تھا۔ میں تو کچھ بول بھی نہیں پا رہا تھا۔ چوزے مرتے ہیں۔ کہیں انہیں چیل اٹھا کر لے جاتی ہے اور کہیں کُتے کھا جاتے ہیں۔ کبھی یہ ناحق کی موت مرتے ہیں اور کہیں انہیں گھر کے مالک اپنے ہی پاؤں تلے روند کر مار دیتے ہیں۔ مرتے تو ہیں۔ پھر کون سی بڑی بات ہے۔ اور جو چیز یہ صاحب اپنے ہاتھ میں لئے اس قدر پریشان لگ رہے تھے۔ ہر گز ایسی نہ تھی کہ جس کی موت کو لے کر اچھا خاصا آدمی اول فول بکنا شروع کر دیتا۔ کروئیں جیسے ملائم کالے کالے بال دونوں بازوؤں کے اردگرد قدرے موٹے لیکن بہت چھوٹے اور لمبی پتلی ٹانگیں۔ اس کی کمر پر ایک طرح کی سفید کھرنڈ سی جم گئی تھی جو مجھے غلیظ سی شے لگی۔ پھر بھی کچھ اپنا اشتیاق تھا اور کچھ اس کی دل جوئی مقصود تھی کہ میں بول اُٹھا۔

"اچھی نسل کا چوزہ ہو گا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"بلا مار نسل کو" وہ چڑ کر بولا۔ "ہم نے اس کی نسل اور ذات کو لے کر چاٹنا ہے کیا؟ رہا ہو گا کچھ بھی۔ ممکن ہے اچھی نسل کا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نہ ہو۔ مگر خیر"۔ لمبی سی آہ بھر کر وہ اپنے کندھے سکوڑ کر میری طرف گھور کر بولا۔

"مجھے ہرگز اس بات کا یقین نہ تھا۔۔۔۔" وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی اُمڈ آنے لگے تھے۔

"کس کا نام؟" وہ چلّایا۔ اُس کے لہجے اور بات کرنے کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ مجھ سے نہیں بلکہ اپنے دائیں پاؤں کے انگوٹھے سے مخاطب ہے۔ اُس کی نظریں اُسی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں لاجواب ہو گیا تھا۔ پھر بھی محض خفت مٹانے کی غرض سے آنکھیں میچ میچ کر چوزے کے جسم کو ٹٹول رہا تھا کہ شاید وہ سربستہ راز جان پاؤں کہ جس کی بناء پر اس حقیر سے چوزے کو فوقیت بخشی گئی ہے۔ راز جو یہ شخص جان گیا ہے لیکن میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔

اتنا کالا رنگ، نحیف جسم اور بدزیب سراپا لیے یہ چیز مجھے ایک معمولی سا چوزہ لگ رہی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ کمر میں پھیلی کھرنڈ نے اس کے جسم کو اور بھی بدنما بنا دیا تھا، تاہم مجھے بات بڑھانے کا ایک اور موقعہ ہاتھ لگا تو میں نے سوال کیا۔

"یہ اس کی کمر کو کیا ہوا ہے؟"

اب جیسے وہ پہلی بار چوزے کی کمر دیکھ رہا تھا۔ اپنے دائیں ہاتھ سے چوزے کے داہنے بازو کا ایک پر ہٹا کر اس نے جس انداز سے چوزے کے جسم پر نظر ماری، وہ میرے اندر کا اشتیاق بیدار کرنے کے لیے کافی تھا۔ چوزے کے جسم پر سفید آٹے جیسی کوئی چیز مَل دی گئی تھی جو اب خشک ہو کر پپڑیوں میں بدل گئی تھی۔

"چہ چہ چہ بس اسی کارن اس کی جان بھی چلی گئی" وہ بولا "سچ ہے یہاں کوئی کسی کا نہیں۔ نہ ماں نہ باپ، نہ بھائی، نہ بہن۔ سب رشتے جھوٹے ہیں۔

"اتنا لمبا فلسفہ "میں سوچنے لگا"۔ یہ بھی بھلا کس لئے؟"

"یہ پاؤڈر ہے جو اس کی کمر میں وٹرنری والوں نے چھڑک دی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اسے پھینک کیوں نہیں دیتے۔ یوں ٹکر ٹکر دیکھنے میں فائدہ۔"

"ہاں اب وہی کرنے جا رہا ہوں۔ وہ بڑی بے بسی سے بولا۔ یوں جیسے کسی اپنے عزیز کو دفنانے جا رہا تھا۔

"تو رکھ دو اسی گٹر کے کنارے۔" میں نے صلاح دی۔ "کتا یا کوا کہیں سے آکر اس کو اُٹھا لے جائے گا اور کھائے گا۔"

"کیا بات کہی تم نے؟" وہ ناراض ہو گیا۔ "تم بھی اسی دنیا کے باسی ٹھہرے۔"

"پھر یہ کیا کرے گا اس کا؟' میں حیران تھا۔
"میں سمجھتا تھا کہ تم کچھ ہوگے۔ بات کی تہہ تک پہنچ سکوگے۔ لیکن خیر "مایوس ہو کر وہ بولا جس پر میں خفا ہو کر رہ گیا۔ جیسے مجھ سے گناہ سرزد ہوا تھا اور اب تائب ہو رہا ہوں۔"
"ہر کوئی اس کے پیچھے پڑا تھا۔ کسی کو اس پر رحم نہ آیا۔" یہ کہتے ہوئے وہ ہاتھ آگے لے آیا۔ اسے چھاتی سے لگا کر یوں دیکھتا رہا کہ جیسے اس کے مردہ جسم کو طراوت اور تازگی بخشے جا رہا ہو۔
"یہ بھی پورے اکیس دن تک گھاس کی ٹوکری میں بیٹھا زندگی کے مزے لیتا رہا ہوگا جانے کیا کیا ارمان لے کر اس دُنیا میں آیا ہوگا" وہ تو خود سے یا چوزے سے مخاطب تھا۔
"تم نے کبھی بید مشک جیسے چوزے کو گھاس کی ٹوکری میں بیٹھے دیکھا ہے؟" اس نے مجھ سے سوال کیا جس پر میں نے "ہاں" کہہ دی۔
"کتنا نازک ہوتا ہے وہ" وہ بولا "نوزائد بچہ" "گائے کا بچھڑا، چوزہ اور پھول، ان سبھی کے مزاج ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ ان میں خوف کا جذبہ نہیں ہوتا نہیں تو لگتا ہے کہ قدرت کے کارخانے صرف ان ہی کی نشو ونما کے لئے وجود میں لائے گئے ہیں۔" میں ہمہ تن گوش تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔ "اگر میں ایک دم اپنا ہاتھ چلانے لگوں، تم ایک دم ڈر جاؤ گے۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لئے کہ تم میں خوف کا جذبہ بیدار ہے اور بالغ ہے۔ اب تم اس پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ اس کے مقابلے میں تم اگر دودھ پیتے بچے کی گردن پر چھری رکھ دوگے، وہ مسکرا دے گا...... سمجھ گئے میری بات؟ ہاہاہاہا" وہ ہنسنے لگا۔
"اگر پھول کو اس بات کا پتہ چل جائے کہ ایک دن اُسے ڈالی سے توڑ کر مسل دیا جائے گا، پھینک دیا جائے گا۔ وہ کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جائے گا۔ محض ڈر کی وجہ سے۔"
میں ہنس نہیں رہا تھا بلکہ سوچ رہا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ میری نظروں کے آگے بہت بڑا کارواں گذر رہا ہے۔ ایک کارواں پینزی کے پھولوں کا جرمن فلسفیوں کی سی متانت چہروں پر سجائے۔ ایک کارواں معطر گلابوں کا، معشوق کی اداؤں جیسی مستی لئے، سنہری تھالی میں قرینے سے سجائے گئے سدا بہار پھولوں کا کارواں، بادشاہوں جیسی دستارِ فضیلت سر پر سجائے بنفشے کا، مجھے یوں لگا کہ یہ سارے پھول اپنے ہی بانکپن میں مست و مغرور میری نظروں کے آگے رواں دواں ہیں اور ان کے آگے پیچھے پرندوں کے غول اُڑ رہے ہیں جن میں مینا ہے اور چڑیاں بھی۔

کوے بھی ہیں اور چیل بھی۔ جیسے یہ سارے پنچھی آکاش سے اُتری اپسراؤں کی مانند ساتھ ساتھ اُڑتے چلے جارہے ہیں۔

"سب اُسی کی قدرت۔۔۔۔"

"کس کی قدرت۔" یہ الفاظ اُس نے میرے مُنھ پر دے مارے اور میں ہکا بکا رہ گیا۔

"ڈر گئے؟" وہ مسکرا کر بولا "تم بھی کورے ہی نکلے۔ تھوتھا چنا۔۔۔ بالکل اناڑی۔۔۔

"تمہیں شاید نہیں معلوم" وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس چوزے کو ایک چیل نہ جانے کن اطراف سے اُٹھا کر یہاں لے آئی تھی۔ اپنے بے رحم پنجے اُس نے اس معصوم کے سینے میں گاڑ دئے تھے۔" وہ تو اسے لے جا کر مار دیتی اور کہیں بیٹھ کر اطمینان سے کھا جاتی۔"

"تم نے سُنا!" وہ بولا "وہ اسے کھا جاتی کہ اچانک یہ اس کے بے رحم پنجوں سے گر پڑا اور سیدھے ہمارے آنگن میں آرہا۔"

"آنگن میں اس کے گرتے ہی ایک تو میری نظر اس پر گئی اور میرے ساتھ ہی ایک کُتے کی بھی۔"

"پھر۔اس کے بعد" میری دل چسپی بڑھ گئی تھی۔

"ہم دونوں اس کی طرف لپکے۔ میں بھی اور کُتا بھی۔ یہ میرے ہاتھ تو نہیں لگا۔ البتہ کُتے نے اس کو جھپٹ لیا۔"

"وہ اسے مارنے والا تھا کہ میں نے جھٹ سے ایک پتھر ہاتھ میں لیا۔ پتھر دیکھ کر کُتا ڈر گیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔"

"اب وہاں صرف میں تھا۔ میں۔ چوزہ اپنی پتلی پتلی ٹانگوں کے سہارے بھاگ نکلنے کی کوششیں کرنے لگا۔ ساتھ ہی اپنی کمزور سی آواز میں چوں چوں کرتا رہا۔ مجھے لگا کہ یہ اُسی کو پُکار رہا ہے جس نے بھوس کی ٹوکری میں بٹھا کر اس میں جان ڈالی تھی۔ لیکن۔۔۔"

"تب میں نے۔ ہاں میں اسے اُچک لیا۔" ایک لمحے کے لیے اُس نے چُپ سادھ لی۔ پھر ایک ہُم کے ساتھ کھنکارتا ہوا بولا۔

"مان لو اگر درجن بھر بھیڑیئے، شیر، چیتے، سانپ یا پاگل کُتے تمہاری جان کو آجائیں۔ یہیں اور اسی وقت تمہارے پیچھے پڑ جائیں۔ سوچ لو تمہاری کیا حالت ہو گی۔ اپنی زبان سے بیان کر سکو گے؟ ہرگز نہیں۔ کوئی بیان نہیں کرسکتا۔ وہ بھی نہیں جس کے پیچھے سچ مچ لپکے بھی ہوں۔

جانتے ہو کیوں؟" سوال تو وہ مجھ سے کر گیا مگر جواب بھی خود ہی دے گیا۔ "اس وجہ سے کہ ایسے حالات میں انسان کے حواس جاتے رہتے ہیں۔ اعضا معطل ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک دم بھاگنے کو دوڑ پڑتا ہے۔ مگر کہاں؟۔۔۔ اس چیز کی اُسے سودھ بودھ نہیں رہتی ۔ آدمی بھاگتا ہے۔۔۔ کہاں۔۔۔ معلوم نہیں۔۔۔ وہ دیکھتا ہے۔ کیا؟۔۔۔ وہ نہیں جانتا۔ آدمی کہتا ہے۔۔۔ کیا؟ وہ نہیں جانتا۔ وہ خود بھی نہیں سمجھ پاتا۔"

"میں نے چوزہ اُچک لیا۔ خوف کی وجہ سے یہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ خوف ہی کی بناء پر اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آنے کو تھیں اور خوف ہی کی وجہ سے یہ اپنی کمزور سی آواز میں چوں چوں کر رہا تھا۔ شاید یہ رو رہا تھا۔ گڑ گڑا رہا تھا۔ شاید کہہ رہا تھا کہ میں نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔ میں ایک معمولی سا چوزہ ہوں۔ مُرغی کا بچہ ہوں۔ تم مجھے مرغا بننے دیتے۔ صبح اور شام بانگ دیتا۔ مرغی بنتا تو انڈے دیتا رہتا۔ میں تو کچھ اور کر ہی نہیں سکتا تھا۔"

"میرے گھر میں بہت ساری مرغیاں ہیں۔" وہ بولا "ان ہی میں ایک مرغا بھی ہے صبح اور شام بلا ناغہ بانگ دیتا رہتا ہے۔ مرغیاں یا تو دن بھر گاتی ہیں یا انڈے دیتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ انڈوں پر بیٹھتی بھی ہیں۔ ایک بھرپور گھرانہ ہے اُن کا جس میں ہر ایک اپنے آپ میں مگن ہے۔ ایک خاوند کے پیچھے اُس کی چار چار بیویاں۔ چنانچہ میں اس چوزے کو گھر لے گیا اور وہیں ڈربے کے اندر ڈال آیا۔ میرا خیال تھا کہ چوزہ وہیں رہے گا۔ پلے بڑھے گا۔ یہ ان ہی مرغیوں کے درمیان خوش بھی رہے گا بڑا ہو گا تو کسی روز اسے ہم ذبح بھی کر دیں گے۔ اس کی بوٹیاں کھائیں گے۔ مجھے یقین تھا کہ اپنی ہی نسل کے جانوروں میں رہ کر اس کے سارے خوف جاتے رہیں گے۔۔۔ مگر کہاں؟"

"بس گھنٹہ بھر ہی گزرا تھا کہ یہ مر گیا۔" یہ کہتے ہوئے وہ میری طرف مُڑا۔ "ایسی نظروں سے مجھے گھورنے لگا کہ جیسے خود کو خدا ثابت کرنا چاہتا ہو اور مجھ ناچیز کو حقیر بندہ۔"

"مرغیوں نے چونچیں مار مار کر اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دی تھی۔ اس کی کمر کی ہڈیاں گوشت اُتر جانے کی وجہ سے ننگی ہو گئی تھیں۔ اس کے زخموں سے لہو رِس رہا تھا۔ کچھ خشک ہو کر جم گیا تھا۔ یہ بے چارہ دور ایک کونے میں دُبک کر بیٹھا تھا۔ شاید زندگی سے ہار گیا تھا۔

"اور اب جو میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے بھاگنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ یہ تو مچلا بھی نہیں۔ بس اپنی کمزور آواز میں 'چیچ چیچ' کرتا رہ گیا۔ یہ شاید کچھ کہہ رہا تھا۔ شاید

یہی کہ ”لو میں مر رہا ہوں۔ تم خوش ہو جاؤ۔ تم جو کوئی بھی ہو۔۔۔ آدمی، کتایا چیل۔ یا میری ہی قبیل کے مُرغ۔ تم خوش ہو جاؤ کہ میں مر رہا ہوں۔ اب تو نہ میں بانگ دے سکوں گا اور نہ انڈے۔ میں اب کسی کام کا نہ رہا۔ کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ اب تو وہی کروں گا جو تم مجھ سے کروانا چاہتے تھے۔ میں مر جاؤں گا۔ چیچ چیچ چیچ۔“

اپنے ہاتھوں میں اُٹھائے میں نے اس کے آگے چاول رکھ دیئے۔ چند دانے اس نے چگ بھی لئے۔ شاید اپنی بھوک مٹانے کی خاطر۔ یا شاید میرا بھرم رکھنے کی خاطر کہ لو ہمارا کیا جاتا ہے، تمہاری اگر طبیعت بہل جائے۔“

”سُنا ہے کہ اللہ بڑا کارساز ہے۔“ وہ بولا ”ویٹرنری والوں نے اس کے زخموں پر پاؤڈر چھڑک دیا۔ اپنے طور پر میں نے بھی اس کو گرمی پہنچانے کی بہت کوشش کی حالانکہ اب اس کو اس کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس کو اب کسی بھی چیز کا خوف نہ تھا۔ میرا بھی نہیں۔ یہ صرف چیچ چیچ کی آوازیں نکال رہا تھا۔ شاید مجھ پر ملامت کر رہا تھا۔ کہ لو بھئی۔ جو کوئی بھی تم ہو۔ آدمی۔ کتایا چیل۔ میں تم سے مخاطب ہوں میں نے کہہ دیا ہے کہ میں مر رہا ہوں.......... اور کچھ دیر بعد تو یہ مر بھی گیا۔“

وہ رو رہا تھا۔ مُردہ چوزے کو دیکھ دیکھ کر بین کر رہا تھا۔ دیکھا تم نے؟.......... یہ تو مر ہی گیا ہے۔“

امین کامل

مترجم - بشر اختر

پت جھڑ کی آندھیاں

اب تو یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں چلا گیا اور نہ ہی ہم اتنے بھی بے کار بیٹھے ہیں کہ اس کے بارے میں لوگوں سے پوچھتے پھریں۔ بڈھا کھوسٹ، معمول سے زائد عمر آسمانی فرشتوں کی نظروں سے چھپتا ہوا در بدر بھٹک رہا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ بہت ہی باتونی تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے بچوں کو اب بھی اُس کی یاد آ ہی جاتی ہے۔ انہیں اُس کی باتوں میں مزہ ملتا تھا، اسی لیے۔۔۔

وہ جب بھی ہمارے یہاں آدھمکتا تھا سارا دن غارت کر کے رکھ دیتا تھا۔ میرا کوئی بھی دوست میرے گھر آنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی اُلٹے پاؤں لوٹ جاتا تھا۔ کون ہے جو اس سے عاجز نہ تھا۔ جس کے کان اُس کی بکواس سنتے پک نہیں گئے تھے۔ بات بات پر ایک ہی بات کی رٹ کہ "لو تاریخی واقعہ بتاتا ہوں۔"

نام اُس کا عظیم بب تھا، لیکن لوگ اسے اس کی پیٹھ پیچھے "بکواسی" کے نام سے بھی یاد کرتے تھے۔

ایک دن وہ ہمارے یہاں آیا ہوا تھا۔ بس وہی دن اُس کے آدھمکنے کا آخری دن ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ اسی روز ایک حادثہ ہوا کہ جس کے واقع ہونے کا مجھے اب بھی افسوس ہے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ہونی کے لیے مناسب حالات پہلے ہی ترتیب پاتے ہیں۔ پس وہ دن اور آج کا دن، اس کے بارے میں کوئی پتہ نہ چل سکا۔

خزاں کے دن تھے۔ آسمان میں ہر طرف ہلکا سفید بادلوں کا جال سا تن گیا تھا۔ ڈوبتا سورج ان ہی بادلوں کے پیچھے اپنی منزل کی جانب گویا لڑھکتا جارہا تھا۔ میں دفتر سے گھر واپس آچکا تھا اور صحن میں کُڑک لگی ایک مرغی کی دُم میں پھونس باندھنے میں مگن تھا۔ سُنا ہے کہ مرغی کی دُم میں پھونس باندھے جانے کے بعد اُس کی کُڑک جاتی رہتی ہے۔ لیکن یہ مرغی میری حرکت پر باضابطہ بین کرنے پر اُتر آئی تھی، مرغی سے بڑی قیامت ہمسائے کے مرغ نے برپا

کردی تھی۔ جانے وہ کیا سمجھ بیٹھا تھا۔ شاید یہی کہ میں ناحق اس کی مُرغی کو ہڑپ کرنا چاہتا ہوں۔

اچانک باہر سے بچوں کا شور بلند ہوا۔ ''عظیم بب آگئے۔ لبّا عظیم بب آگئے۔'' یہ سن کر تو میری جان نکل گئی۔ دُم میں پھونس بندھی مُرغی کو دو ٹانگوں کے بیچ پھنسا کر میں گویا بھوت بن کر کھڑا تھا۔ اور یوں عظیم بب آنگن میں وارد ہوئے۔ ان کی برف جیسی سفید اور صاف لمبی اور گھنی داڑھی تھی۔ بھرا بھرا چہرہ تھا جس پر امبری سیب کی سی سُرخی چھائی ہوئی تھی۔ چوڑی چھاتی تھی۔ اور جسم مضبوط تھا حالانکہ کافی عمر رسیدہ تھے۔ کون ہے جو آج کل اتنی لمبی عمر پاتا ہے۔ یہ تو ناممکن سی بات ہے۔

''لبّا لبّا عجیم بُلہ بب آگئے ہیں۔'' جانو اپنے خیال میں خوشخبری دے رہی تھی۔

''یہ میرے عظیم دادا ہیں۔'' گلو فخر سے بولا۔

''اوں۔ بڑے آئے تم۔'' اُسے ٹھینگا دکھا کر بولی۔

''میں تم دونوں کا دادا ہوں۔'' عظیم بب ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ''سبھی کا دادو'' وہ مسکراتی آنکھوں سے میری اور دیکھ رہے تھے۔''

''اس میں کیا شک ہے۔ اسلام علیکم جی۔'' مجھ سے جب کچھ بھی نہ بن پڑا، کڑک مرغی ایک طرف چھوڑ کر چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر اُس سے پوچھ بیٹھا۔

''آج بڑے دنوں بعد آئے ہیں۔ خیریت ہے؟''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔'' وہ اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے، جس پر زمانے نے لاتعداد مہریں جھریوں کی شکل میں ثبت کردی تھیں۔

''تم یہاں کیا کر رہے تھے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک نظر مجھے اور ایک نظر مُرغی کو دیکھتے رہے جو دُم میں پھونس بندھی عجیب طرح کا ناچ، ناچ رہی تھی۔

''یہ جی۔ کیا نام۔ کڑک مرغی۔ پھونس باندھ۔۔۔ میں جھینپ گیا تھا۔ میرے منھ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

''اچھا اچھا۔ تو یہاں تک آگئے ہیں نئی پیڑھی کے مرد۔'' عظیم بب آنگن میں پُری او کھلی پُری بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''کڑک مُرغی کے پھونس بھی باندھنے لگے ہیں۔ اگلے وقتوں میں ۔۔۔ سنو۔ تاریخی واقعہ بتاتا ہوں۔ اور یوں ان کی بکواس شروع ہوگئی۔۔۔ ''سلطان شہاب الدین جو ہمارے کشمیر کا نامور فرزند تھا، ایک قدر بہادر کہ کابل، بدخشاں، غزنی، قندہار، ہرات،

تبت، گلستان اور لاہور فتح کرتے ہوئے دلّی پر بھی فوج کشی کرلی۔ فیروز شاہ وہاں کا حکمران تھا۔"
عظیم بب اپنی دستار پیشانی پر جمانے لگے جیسے وہی بذاتِ خود سلطان شہاب الدین ہیں۔
پھر یوں ہوا کہ اوپر سے اُڑتی چیل کا سایہ ہوائی جہاز کی رفتار سے آیا اور چلا گیا۔ مُرغ نے ایک دم خطرے کا بگل بجادیا اور مرغیاں اپنے اپنے چوزے لے کر فوراً آڑ میں چلی گئیں۔
مجھے بات بدلنے کا بہانہ مل گیا اور میں بولا۔

"چلیئے۔ اندر چلتے ہیں۔ گھر میں ابھی تک آپ کے آنے کی اطلاع نہیں ہے۔ ورنہ میری بیگم لپکتی ہوئی باہر آگئی ہوتیں۔"

"ٹھیک ہے۔ چلو" اُس نے قہر بھری نظروں سے چیل کو دیکھا۔ "تم چلو میں ذرا کلوخ لے لوں"

"میں عجیم بب کے پاش بیٹھوں گی۔" جانو اپنے بھائی گلو کو چڑاتے ہوئے بولی۔

"میں بھی بیٹھوں گا۔ اُن کی گود میں بیٹھوں گا۔ گلو تن کر بولا جس پر جانو اپنے منھ سے "ہپ" کی آواز نکالتی ہوئی دونوں گال پُھلانے لگی۔

"تیری تو ناک بہتی ہے"!! گلو اپنی بہن کی چوری پکڑتا ہوا بولا۔

"نہیں تو" جانو ایک دم اپنی ناک آستین سے رگڑتی ہوئی گلو پر برس پڑی "تم تم تو" لفظ اُس کی زبان تک نہ آسکے تو وہ بولی "ابھی تیری ٹانگ میں کاٹ دوں گی۔"

ہمارے یہاں رہنے کے لیے جگہ بہت کم ہے۔ نچلی منزل میں ایک کمرہ ہے جس میں ایک طرف رسوئی ہے اور ایک طرف ہم نے بیٹھنے کا انتظام کرر کھا ہے۔ اوپر والی منزل میں دو چھوٹے کمرے ہیں جہاں ہم سوتے ہیں۔ مہمان کے بیٹھنے کا انتظام اوپر کے کمرے میں ہوتا ہے۔ لیکن عظیم بب، ہم سبھی کے داداجو ٹھہرے، چنانچہ میں رسوئی کی طرف بڑھنے لگا۔

اندر آتے ہی میں نے بیوی کو خبر دینی چاہی کہ عظیم بکواسی آدھمکا ہے۔ ساری رات اکارت جائے گی۔ جس پر وہ بولی "میں نے اُسے آنگن میں آتے ہی دیکھ لیا تھا۔" دیکھا کہ اُس نے سماوار میں قہوے کے لیے پانی بھی رکھ دیا تھا۔

"آہا" عظیم بکواسی!! گلو کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"اے چُپ" میں نے گلو کو ڈانٹا "یہ نہیں کہنا چاہیئے۔ زبان کاٹ کے رکھ دوں گا۔"

"کاٹو۔۔۔ کاٹو اس کی جبان" جانو گلو پر داو چلاتے ہوئے بولی۔

''آپ بھی عجیب ہیں۔'' میری بیوی بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ''موقعہ محل دیکھے بغیر ہی منہ سے کچھ بھی بک دیتے ہیں۔''

ایسے میں عظیم بب کی چاپ سنائی دی اور ہم نے چُپ سادھ لی۔۔۔میں حقہ تیار کرنے لگا اور بیوی سماوار میں پھونکیں مارنے لگی۔

ہم مَردوں کو جس قدر عظیم بب سے نفرت تھی۔ اُسی قدر وہ ہمارے گھر کی عورتوں کا چہیتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کبھی کبھار وہ عورتوں کی بہادری کے بارے میں بھی اوٹ پٹانگ سی داستانیں بک دیا کرتا تھا۔ عورتوں کی ذہانت ہونہہ۔ فقط ہم مَردوں کے دکھاوے کی خاطر کہ دیکھو ہم بھی کسی سے کم نہیں۔

عظیم بب، گلو اور جانو کے درمیان تشریف فرما ہوئے۔ سر سے پرانے طرز کی پگڑی اتار کر فرش پر رکھ دی اور کالے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پر سکون ہو کر میری بیوی سے مخاطب ہوئے۔

''بیٹی!! تم ٹھیک ہو نا۔ میں نے تم کو دیکھا ہی نہیں۔''

''اسلام علیکم بی۔ میں نے ابھی ابھی آپ کو سلام کیا تھا۔ آپ نے شاید سنا نہیں۔''

وہ یا تو جھوٹ بول رہی تھی یا شاید سلام کیا ہو۔ جو میں نے بھی نہ سنا ہو۔

''عظیم دادو'' جانو یہ کہتی ہوئی اس کی گود میں بیٹھی اور بازی لے گئی۔

''عظیم دادو'' گلو اس کی بغل میں سٹ گیا۔

''بیٹی تم اتنی کمزور کیوں لگ رہی ہو۔'' وہ اب بھی بیوی سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے۔'' ''دودھ دہی پیٹ بھر کر کھانا چاہئیے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ اگلے وقتوں کی عورتیں کتنی بہادر ہوا کرتی تھیں۔ سنو تو اریخ ہے۔''

''جی سُن رہی ہوں۔'' میری بیوی سچ مچ سننے لگی تھی۔ وہ ہمہ تن گوش تھی۔ اور عظیم بب کہہ رہا تھا۔ ''رانی جیشو ایک کشمیری خاتون تھیں۔'' یوں عظیم بب داستان سرائی کرنے لگے تھے اور میں کھڑکی سے باہر نظریں اٹھا کر سامنے والے پیڑ کی شاخیں گننے میں لگ گیا تھا۔ میں سوچنے لگا تھا کہ لکڑی مہنگی ہو گئی ہے۔ گزارہ کیسے ہو گا۔ اور عظیم بب کہہ رہا تھے کہ وہ دنیا کی پہلی عورت تھی جو شاہی تخت پر بیٹھی تھی۔ تاریخ بیان کر رہا ہوں۔ کشمیر سے چل کر ہندوستان پر فوج کشی کی تھی۔ متھرا میں سری کرشن سے جنگ لڑی تھی۔ عظیم بب مٹھیاں بھینچ کر بول رہے

تھے مجھے لگا کہ خود بھی میدان جنگ میں کھڑے ہیں۔ اور جیشو کی مدد کر رہے ہیں۔
گُڑک مرغی کی دُم میں پھونس باندھنے کی بجائے اس نے بھگوان کرشن پر ایک کشمیری عورت کی بہادری ثابت کر دکھائی تھی۔

میری بیوی داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی کہ جیسے کہہ رہی ہو "آئی بات سمجھ میں"؟ بی پر میں نے دھوئیں کا سامر غولہ اُس کی طرف یوں پھینک دیا کہ "پھر رورہ۔

"چچو متی کہلاتی تھی نا، جانو اپنی یادداشت کا امتحان دے رہی تھی۔ جس پر گلو نے طنزاً کہا۔ چچو متی نہیں جیشو متی۔ ۔ جے۔ شو۔ متی سے دھیان ہٹانے کی غرض سے میں نے پھر ایک بار پاٹ بدلنے کی کوشش کی اور عظیم بب سے پوچھا۔

"ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ کیا تکلیف تھی آپ کو؟"

"ہاں یار معدے میں کچھ گڑبڑ تھی۔" اگلے وقتوں میں لوگ سادہ غذائیں کھاتے تھے۔ جس سے طاقت ملتی تھی بدن کو۔ خیال کرو" وہ پھر بکواس پر اُتر آیا"ایک ہاتھی کو شراب پلا کر بدمست کیا گیا۔ اور ایک کشمیری نوجوان کو اُس کے آگے ڈال دیا گیا ہاتھی اس کے ٹکڑے کر دے گا۔ "غور سے سنو تاریخ سُنا رہا ہوں۔" ہاتھی پاگل ہو گیا تھا۔ لیکن اُس جوان کی ہمت دیکھو اس پر میں اپنا سینہ تان کر بیٹھ گیا۔" لیکن میری بیوی چائے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "اس جوان نے نیام سے تلوار نکال لی اور ہاتھی پر قیامت ڈھادی کہ شراب کا نشہ ہی ہرن ہو گیا۔ یہ کشمیری جوان۔ " تاریخ سُنا رہا ہوں۔ ۔ "اُس نے نام بتادیا جو میں نے سُنا ہی نہیں۔ کیونکہ میں سوچ رہا تھا کہ کل اگر ساگ بیچنے والی آگئی تو میں اُس کو کیا منہ دکھا سکوں گا۔ گیارہ روپے اُس کے قرض تھے اور میری تنخواہ ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

"میں بھی ہاتھی مالوں گی۔" جانو اپنے بھائی گلو پر بہادری جتانے کی غرض سے بولی "پچھاڑ دوں گی اُسے۔"

"وہ کہاں ہے ہاتھی؟" گلو نے اُسے لاجواب کر دیا۔ "چولھے میں سے چوہا نکلتا ہے نا۔ میں اسی کو ماروں گا" وہ بازو گھما کر بولا۔

عظیم بب مسکرائے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گلو سے کہنے لگے "تمہیں چاہیئے کہ تم زمین لڑ کے بن جاؤ۔ سُنا بن جاؤ۔ سنو تاریخ تارہا ہوں۔

سو جتن سے میں نے ایک بکواس ختم کرادی تھی لیکن یہاں دوسری شروع ہو گئی تھی ''سُیا ایک غریب کشمیری لڑکا تھا۔ اُس نے بہت ساری کتابیں پڑھی تھیں۔ خوب پڑھتا تھا۔ نہ کسی سے لڑائی نہ جھگڑا۔ ایک دن جب بڑا ہوا۔۔۔۔ ''آہا'' عظیم بب تو بچے ہی بن گئے تھے ''کیا کیا نہریں کھداوئی جن کی مدد سے لوگوں نے دھان کے کھیتوں کی سینچائی کی۔ دریاؤں پر باندھ باندھے جن سے سیلاب کی تباہ کاریاں رُک گئیں۔''

خیر سے میری بیوی چائے لے آئی اور میں خدا کا شکر بجالایا۔

'چائے لیجئے۔'' میں نے عظیم بب سے کہا یہ کہاں چھوڑنے والے ہیں۔ بچو! کیوں تنگ کر رہے ہو انہیں۔ جاؤ جاکر آنگن میں کھیلو۔'' عظیم بب کو کھانسی آگئی۔ شاید گلے میں پھانس تھی۔

''عظیم بکواسی''گلو بے اختیار بول اٹھا۔

''کاٹو۔۔۔ کاٹو اس کی جبان۔'' جانو نے پردہ فاش کر دیا تھا اور میرے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ میری بیوی سر جھکائے دانتوں سے اپنا ہاتھ چبانے لگی تھی۔

''بیٹی تم چائے تو انڈیلو۔'' عظیم بب میری بیوی سے بولے۔ میں سمجھا کہ گلو کی بات اُس نے شاید سنی ہی نہیں ہو گی۔

خفیف سی ہو کر میری بیوی نے اس کے لئے چائے انڈیلنا شروع کر دیا چائے انڈیل کر وہ کھڑی ہو گئی اور قہر آلود نظروں سے میری طرف گھور کر دیکھا کہ جیسے کہہ رہی ہو ''تم نے مجھے ذلیل کر کے چھوڑا ہے۔'' جانو کو گود میں اٹھائے وہ گلو کو بھی بُلا کر لے گئی۔

گلو کی اس بیوقوفی کے بعد ہم دونوں میاں بیوی بچوں کے تئیں محتاط رہنے لگے کہ کہیں یہ دوبارہ عظیم بب سے گھلنے نہ پائیں۔ بچوں کا کیا ہے کچھ بھی بول سکتے ہیں۔ اگر دوبارہ ایسی حرکت ہوئی تو فوراً سمجھ جائیں گے کہ بات پہلے بڑوں سے چلی ہے تب جاکر بچوں تک آئی ہے۔ چنانچہ ہم تاک میں رہے کہ ان تینوں کو الگ نہ رہنے دیا جائے۔ جس پر میں وہاں اُٹھ بھی نہ سکتا تھا۔

عظیم بب ہمارے یہاں رات کو رہے اور آدھی رات تک مغز چاٹتے رہے۔ بات بات پر مثال اور ہر مثال پر ایک ہی بات کہ ''سنو، تاریخ سُنا رہا ہوں'' یہاں تو ہزار ہا پریشانیوں نے زندگی اجیرن بنادی تھی۔ کہاں ایسی داستانیں لئے بیٹھنے کی فرصت تھی۔ للتادتیہ نے کون

کون سے کارہائے نمایاں کئے۔ بڈشاہ کی کون سی عنایتیں ہیں۔ ابھینو گپت کس بلا کا نام تھا۔ اکبر کی فوجوں کے ساتھ کشمیریوں نے کس طرح لڑا۔ اُس کشمیری شاعر نے کمال کردیا ہے۔ یہ عورت کتنی بہادر تھی۔ فلاں عالم کیا تھا۔ الغرض یہ ساری مغزماری ہے۔ محض سر درد۔"

صبح مرغ کی بانگ ہوئی اور عظیم بب منہ ہاتھ دھونے کی خاطر گھر سے باہر چلا گیا۔ باہر چاروں طرف خزاں کی آندھیوں کا شور تھا۔ ہم لوگ معمول سے پہلے ہی جاگ اُٹھے تھے۔ ہمارا جاگنا تو ضروری تھا لیکن بچے بھی بستر چھوڑ کر نکل آئے تھے۔ آندھیاں زوروں کی چل رہی تھیں جن سے درخت ہل رہے تھے اور چھتیں شور مچا رہی تھیں۔

"عجیم دادو کہاں ہیں؟" جانو نے کہا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ چلا نہ گیا ہو۔ "منہ دھونے کے لیے گئے ہیں۔ کیا تم لوگ اُنہیں باہر بھی نہ جانے دوگے؟"

"منہ دھونے گئے ہیں۔" گلو نے جانو سے یوں کہہ دیا کہ جیسے اُسے سب سے پہلے معلوم ہو گیا تھا۔ "میں باہر گلی میں اس کا انتظار کروں گا۔"

"میں دروازے پر کھڑا ہو جاؤں گا" گلو بہادری دکھانے لگا۔

"دروازے میں آندھی ہے۔"

"آنگن میں بھی ہے۔"

"چلو دونوں گلی میں بیٹھتے ہیں۔" جانو نے سمجھوتہ کرلیا اور دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے باہر چلے گئے۔ آندھی تھی کہ لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ دروازے اور کھڑکیاں زور زور سے بجنے لگی تھیں۔

"اے جی۔ کیا یہ کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔" میری بیوی مجھ سے پوچھ رہی تھی "کیا میں ان کے لیے بھی چاول نکال دوں۔"

"کون جانے!" آہ بھر کر میں بولا "رکھ دو اس کے لیے بھی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ آج رات بھی یہیں نہ رہ پائے۔ دن بھر ایک ہی رٹ لگی رہے گی۔ تاریخ سُنا رہا ہوں" بوڑھا فاضل عمر لئے لئے بھٹک رہا ہے بے چارہ۔۔۔"

"ارے۔۔ تم تو پھر وہی باتیں کرنے لگے۔ دیکھتے نہیں بچے گلی میں بیٹھے ہیں۔"

"تو اور کیا کروں۔ اس نے تو زچ کر دیا مجھے کوئی پوچھے کہ گئی گزری داستانیں بار بار دہرانے کا حاصل کیا ہے؟ ارے بھئی بات ہی کرنی ہے تو آج کے زمانے کی کرو۔"

ابھی ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ باہر دروازے پر کسی کی آہٹ سنائی دی۔ مجھے لگا کہ اندر آتے ہی کوئی واپس مُڑ گیا ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ دونوں کا سانس رکا ہوا تھا۔ یہ عظیم بب تھے۔ شاید ہماری باتیں سن رہیں تھے۔

''اُٹھ کر دیکھ تو لو۔۔ شاید وہی ہیں۔'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''جاتا ہوں بھئی۔'' لاچار ہو کر میں کھڑا ہو گیا۔

عظیم بب جاتے جاتے میرے بچوں سے کہہ رہے تھے۔۔۔

''پرانے مُردوں میں اب جان ڈالنے کا سوال ہی نہیں۔ میں جو روحیں لئے بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ ان کے لیے جسم ہی تیار نہیں۔ میں اب محض بکواس کرنے والا رہ گیا ہوں۔۔۔ عظیم بکواسی۔۔۔ یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے نکل گئے۔ آندھیاں شور مچا رہی تھیں۔

''عجیم دادو چلے گئے۔'' جانو روہانسی ہو کر بولی۔

''ہاں۔۔۔ چلے گئے۔'' گلو حیران تھا۔

میں اُسے واپس بُلا بھی نہ سکا۔ خزاں کی آندھی نے مجھے ننگا کر کے رکھ دیا تھا۔

اوتار کرشن رہبر

جب پردہ اُٹھ گیا

ہال بھرا ہوا تھا۔

دنیا کے ذہین ترین لوگ وہاں جمع تھے۔ اور سبھی پردہ اُٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کیونکہ اب کے جو کچھ بھی وہاں ہونے والا تھا۔ آج تک کہیں نہ ہوا تھا۔ اور نہ ہی ہو سکنے کی اُمید تھی۔ اس بات کا انہیں پورا یقین تھا۔

دنیا میں آئے دن بڑی بڑی کانفرنسیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ بڑے بڑے سیمینار، دلچسپ شو، آئے دن ہوتے رہتے ہیں لیکن آج کا یہ شو منفرد اور لاجواب تھا۔

لوگ حیران تھے کہ جو سوال آج کے اس مناظر میں زیرِ بحث لایا جائے گا کسی کے پاس اُس کا جواب ہوگا بھی یا نہیں۔ اگر ہوا بھی تو کیا ہوگا؟ سوال یہ تھا کہ دنیا میں جتنے بھی شاہکار الگ الگ صورتوں میں قدرت یا انسان کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہوئے ہیں، ان میں کون سا شاہکار عظیم ترین تخلیق مانا جائے گا۔ جو فنی لحاظ سے ارفع و اعلیٰ صفات کا مظہر ہو اور تمام تخلیقات میں اوّل نمبر پر آجائے۔ یہ بھی کہ ہر گاہے ایسی کوئی تخلیق ہے تو اس کے بنانے کے لیے تخلیق کار کے کون سے محرکات تھے۔ کون سے عوامل نے تخلیق کار کی ذہنی اُپج کو تحریک دی تھی۔

چنانچہ آج ساری دنیا کے نامور اور عظیم شاعر، مصور، فلسفی، سائینس داں، مزاح نگار، نقاد، ماہر جمالیات، بیوٹیشن، ادیب، مجسمہ ساز، دانشور اور مفکر ہال میں جمع تھے۔ گویا علم اور عقل کا حاصل اسی ہال کے اندر نچوڑ کر رکھ دیا گیا تھا۔

سبھی کی نظریں ہال کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ ساری کارروائی دنیا بھر کے ٹیلی ویژن کیندروں سے براہِ راست ٹیلی کاسٹ ہو رہی ہے۔

پردہ اُٹھ رہا ہے۔ اور تالیاں بج رہی ہیں۔ روشنی بڑھتی جا رہی ہے اور بڑھتی روشنی

کے ساتھ ساتھ اسٹیج کا ہر پہلو نمایاں ہوتا جارہا ہے۔ اسٹیج کو دُلہن کی طرح سجایا گیا ہے۔ سات عدد طلائی کرسیاں ایک قطار میں رکھ دی گئی ہیں۔ ہر کرسی کے آگے نقرئی میز ہے جو نقش ونگار سے مزیّن ہے۔ ہر میز پر آبنوس کا گلدان ہے جس میں طرح طرح کے پھولوں کو سجادئے گئے ہیں جو ہر طرف خوشبو بکھیر کر فضا کو معطر کررہے ہیں۔ کرسیوں کے عقب میں سُپر کمپیوٹر ہے جس کا اگلا حصہ ایک خوبصورت فریم میں سجادیا گیا ہے۔ فریم کے وسط میں ایک آنکھ ہے جو دیکھنے میں بالکل انسانی آنکھ سے مشابہہ ہے۔ اس میں بھی انسانی آنکھ کی سی چمک اور تازگی ہے۔ پلکیں جھپکانے کا انداز وہی ہے جو انسانی آنکھ کا خاصہ ہے۔ آنکھ کی پتلی کبھی تیز گھومنے لگتی ہے اور کبھی اس کی رفتار سست پڑجاتی ہے۔ آنکھ کے اردگرد ہندسے ہیں۔ ایک سے نو تک۔ اور نو کے بعد صفر آتا ہے۔ شُنیہ۔ یہ شُنیہ اس طرح تریب دیا گیا ہے کہ ہندسوں کا آغاز بھی صفر سے ہوتا اور اختتام بھی اس ہندسے پر۔ ہندسوں کا بالواسطہ تعلق آنکھ کی پُتلی سے جوڑا گیا ہے۔ وہ یوں کہ پُتلی کے گھومتے ہی مطلوبہ عدد میں روشنی پھیلتی ہے اور وہ نمایاں ہونے لگتا ہے۔ روشنی کی کرنیں دور تک پھیلنے لگتی ہیں۔ اس سارے نظام کا کنکشن کہیں سے سُپر کمپیوٹر سے بھی جُڑا لگتا ہے۔ اسٹیج کے ایک طرف مائیکروفون ہے جو ایک لیکچر اسٹینڈ پر رکھ دیا گیا ہے۔ اسٹینڈ کے پاس ہی سنگ مرمر کی تپائی ہے جس پر شیشے کے گلاس کا جگ اور تین گلاس رکھے ہیں۔

ہال کا ماحول سنجیدہ اور پُر جلال ہونے کے ساتھ ہی ساتھ دل پذیر بھی لگتا ہے۔ ہر شخص انتظار میں ہے کہ جانے کیا ہو، جانے کیا دکھایا جائے۔

اسٹیج کی ایک وِنگ میں سے ایک اپسرا نمودار ہورہی ہے اور تھرکتی ہوئی آکر اسٹیج کے وسط میں رُک جاتی ہے۔ وہ ہال میں موجود عظیم ہستیوں اور نامور شخصیات کو جھک کر سلام کرتی ہے اور کمپیوٹر کے پاس جاکر اس کا ایک بٹن دباتی ہے۔ بٹن دباکر وہ دلکش انداز میں مسکراتی ہے اور آنکھ کی پُتلی ساکت ہوجاتی ہے۔ روشنی بجھ جاتی ہے اور ہندسے غائب ہونے لگتے ہیں۔ اب سبھی کی نظریں اسی لڑکی پر مرکوز ہوجاتی ہیں۔

چال ڈھال سے وہ نازک اندام ہے۔ اُس کے جسم کا ہر عضو نہ صرف متناسب ہے بلکہ جاذب نظر بھی۔ اس پر اُس کی زلفیں۔ خم کاکل مجموعی طور سے اپنے خالق کی صناعی کا ایسا نمونہ جو بڑی فرصت سے تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کی تعمیر میں حُسن اور محاسن کا پورا امتزاج رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا کھِلتا ہوا جوبن برجستہ لگ رہا ہے۔

وہ یوں اپنے لب کھولنے لگتی ہے۔ ''ہمیں خوشی ہے کہ آج خوش قسمت لوگوں کی اس کانفرنس کا آغاز کررہے ہیں۔ آج کی رات ایک یادگار رات کہلائے گی کیونکہ اسی رات کو اسرار ورموز کے پردے کھل جائیں گے۔ آج کا موضوع جتنا نازک ہے، اتنا ہی مشکل اور پیچیدہ بھی ہے۔ جب بھی ہمیں پورا یقین ہے کہ دنیا میں ذہانت کی کوئی کمی نہیں۔ یہ اپنے طرز کی پہلی اور آخری تقریب ہوگی۔ مباحثے میں ظاہر کی گئی ہر بات آپ کو نئی بھی لگے گی اور منفرد بھی۔ یہ جاندار بھی ہوگی اور شاندار بھی۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ مجلس کا اختتام بھی اسی قدر پروقار اور دلکش بھی ہوگا۔''

لڑکی کی تائید میں پوراہال تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا۔ لڑکی اپنے منہ سے موتی جھڑ رہی تھی۔ اُس کی جتنی دلکش چال تھی اتنی ہی دلفریب اُس کی ادائیں تھیں، اس کا لب ولہجہ تھا اور مسحورکُن آواز تھی جس میں اثر بھی تھا اور مٹھاس بھی۔

ایک بلا ہے یہ کمپیوٹر بھی، لوگ اس کے حُسنِ انتخاب کے قائل ہورہے تھے کہ بھری دنیا میں اس نے کس خوبی سے اس گوہر یک دانہ کو اس طرح چن لیا ہے کہ جیسے عمیق سمندر میں چُھپا ہوا موتی کا دانہ۔

گہرے سمندر سے موتی کی مالا اُبھر آئی ہے
تم اس کے دانوں کو شمار تو کرو

دنیا کے بہترین اناؤنسروں کی تفصیلات اور اعداد وشمار اس کمپیوٹر کو فیڈ کئے گئے تھے۔ اور اس نے اس لڑکی کا نام سرفہرست رکھ دیا تھا۔ خوش بخت دوشیزہ مسکرائی۔ اس کے سفید موتی جیسے دانت نمایاں ہونے لگے۔ کئی دل زور زور دھڑکنے لگے اور وہ یوں گویا ہوئی۔

''ہمیں خوشی ہے کہ ہماری دعوت پر پوری دنیا کی ذہانت اس ہال کے اندر جمع ہوگئی ہے۔ سارا کام آسان بنانے کی خاطر آپ سب حضرات کے اعداد وشمار کمپیوٹر کو فیڈ کئے گئے۔ آپ کو علم ہوگا کہ کمپیوٹر نے آپ میں سے صرف سات افراد کا انتخاب کرلیا ہے۔ اور یہی سات افراد مقابلے میں حصہ لے رہے ہیں آپ دیکھیں گے کہ کارروائی کے دوران کسی بھی قسم کی گڑبڑ نہ ہونے پائے گی اور ہر کام خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہوگا۔۔۔ رہا سوال کہ یہ سات خوش نصیب کون ہیں؟۔۔۔ یہ عظیم لوگ سائنس داں، شاعر، مصور، مزاح نگار، فلسفی، نقاد اور بیوٹیشن ہیں۔ آپ بھی ان سبھی کو دیکھیں گے۔۔۔ بس تھوڑی دیر کا انتظار ہے۔''

چنانچہ مسکراتے ہوئے اُس نے کمپیوٹر کا ایک اور بٹن دبایا۔ آنکھ کی پُتلی سے روشنی کی لاتعداد شعائیں منعکس ہوتی رہیں جو ہال کے اندر مختلف مقامات پر مرکوز ہو گئیں۔ روشنی ان ساتوں افراد پر پڑی اور وہ ظاہر ہو گئے۔ لڑکی بولی۔

"ان خوش نصیب افراد سے ہماری گذارش ہے کہ اسٹیج پر تشریف لے آئیں۔ اور ان ساتوں کُرسیوں کو زینت بخشیں۔"

ان سات افراد میں پانچ مرد تھے اور دو خواتین، وہ اُٹھ کر ڈائس کی طرف آتے گئے اور اناونسر اس دوران ہر شخص کے بارے میں تفصیلات بیان کرتی گئی۔

تالیوں کی گونج سے پورا ہال لرز اُٹھا۔ یہ لوگ سچ مُچ بے نظیر اور لاجواب تھے۔ اپنے اپنے فن میں یکتا اور یگانہ۔ ان کے کارنامے لازوال تھے اور ہال میں بیٹھا ہر شخص من ہی من کمپیوٹر کی ذہانت کا قائل ہو رہا تھا کہ کس طرح اُس نے دنیا کے ذہین ترین لوگوں کو جیسے چمٹی سے اُٹھا کر اس ہال میں لا کھڑا کر دیا تھا۔

لڑکی کے منھ سے پھر ایک بار موتی جھڑنے لگے۔

"آپ سبھی کو معلوم ہوگا کہ ہمارے سوال کے دو حصے ہیں۔ اس وجہ سے یہاں سوالات کے دو راوئنڈ ہونگے۔ پہلے راونڈ میں سوال کا پہلا حصہ مکمل ہوگا۔ اور اگلے میں دوسرا۔ یہاں زبان کی کوئی قید نہ ہوگی۔ رہا یہ سوال کہ کس کا جواب بر محل، برجستہ اور مکمل ہوگا۔ وہ فیصلہ کمپیوٹر پر چھوڑ دیا جائے گا۔ ہمیں کمپیوٹر کی ذہانت، اہلیت اور دیانت پر کوئی شبہ نہیں۔ اور جس رفتار سے کسی شخص کا جواب وزن دار اور بر محل ثابت ہوتا جائے گا، اُسی رفتار سے کمپیوٹر کی سوئی بھی گھومتی رہے گی۔ یہ ایک سے نو تک جائے گی اور جب یہ صفر پر آکر ٹھہر جائے گی جواب مکمل اور درست مانا جائے گا۔ خدانخوستہ اگر سوئی راستے میں ہی آکر رُک گئی تو لازماً نا قابل ہوگا۔ نہ صرف نامکمل بلکہ نامعقول بھی۔"

ناظرین کا تذبذب اب عروج پر تھا۔ ان میں خاصی تعداد ان لوگوں کی تھی جو ہال سے باہر دُنیا کے مختلف مقامات پر اپنے اپنے ٹیلی ویژن سیٹوں پر یہ ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔

"ایک بات اور" لڑکی دوبارہ اسٹیج پر آگئی۔ "میں ایک بات کہنا بھول گئی ہوں۔ ہم ان ساتوں اشخاص کے بینک اکاونٹ نمبر کمپیوٹر کو فراہم کر رکھے ہیں۔ جس شخص کا جواب مکمل اور درست ہوگا، ایک لمحے کے اندر اس کے بینک اکاونٹ میں ایک کروڑ ڈالر کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

یہ انعام کی رقم ہو گی۔"

اس پر پھر ایک بار تالیاں بجنے لگیں۔ لوگوں کی دلچسپی بڑھ گئی، سبھی بے تاب تھے کہ کب پہلے راؤنڈ کا آغاز ہو گا۔ آنکھ کی پُتلی سے روشنی کی لہر نکلی جو فرداً فرداً ساتوں افراد تک گئی۔ ساتوں افراد طلائی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور روشنی بکھر بکھر کر ساتوں افراد کے چہروں پر پڑ گئی اور آخر میں ایک شخص کے چہرے پر آکر رُک گئی۔ وہ شخص فوراً سمجھ گیا کہ اس کا نمبر آگیا ہے۔ چنانچہ وہ اُٹھا اور مائیکروفون پر آگیا۔ وہ کچھ بول رہا تھا۔ نہ جانے کونسی زبان۔ کوئی بھی اُس کی باتیں نہ سمجھ سکا لیکن ہند سے برابر چمکتے رہے اور سوئی لگاتار حرکت کرتی رہی۔ ظاہر تھا کہ اس کی بات میں وزن تھا۔ ایک ایک کر کے سبھی لوگ مائیکروفون پر آگئے۔ سوئی اس دوران برابر حرکت میں رہی۔ چنانچہ ہر شخص خوش تھا کیونکہ ساتوں بار سوئی صفر پر آکر رُک گئی تھی۔ سبھی کے جوابات مکمل اور دُرست تھے۔

یوں پہلا راؤنڈ مکمل ہوا۔ سب خوش تھے۔ لڑکی خوشی کا بھرپور اظہار کر رہی تھی۔ وہ ناچتی ہوئی اسٹیج پر آگئی اور بولی۔

"ان ساتوں افراد میں کوئی کسی سے کم نہیں۔ ٹکر برابر کی ہے۔ پہلے راؤنڈ میں ہر ایک اول نمبر پر آیا ہے۔ سب کا جواب ایک ہی ہے۔ حالانکہ ہر شخص کی زبان ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ بات کرنے کا انداز بھی جُداگانہ ہے۔ بہر حال۔۔۔ آپ ضرور سوچ رہے ہونگے کہ ان کا جواب کیا تھا؟ بتانا ہم پر لازم ہے۔ لڑکی نے لال رنگ کا بٹن دبادیا اور بٹن دبنے کے ساتھ ہی کمپیوٹر سے ایک کارڈ بر آمد ہوا۔ کارڈ پر لکھی عبارت لڑکی نے پڑھی اور پڑھ کر مسکرانے لگی۔ اُس نے پھول کی پتی جیسے لب کھولے اور بولی۔

ان سبھی حضرات کا بیان ہے کہ۔۔۔۔ سب سے بڑا شاہ کار۔۔۔ ایک ہی ہے۔ اور وہ۔۔۔ میں ہوں۔۔۔ صرف میں۔ نہیں وہ شاہکار۔۔۔ آپ ہیں اشارہ اسٹیج پر بیٹھے ساتوں افراد کی طرف تھا۔ نہیں آپ (اب وہ ہال میں بیٹھے لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی تھی)۔ ہاں آپ۔ آپ سبھی قدرت کا عظیم شاہکار ہیں۔ شاہ کار ہم ہیں، ہم ہم سب۔ مرد اور خواتین۔ شاہ کار آدمی ہے۔ انسان۔ جس کی ہمسری نہ تو کوئی کر سکا ہے اور نہ آگے کوئی کر سکے گا۔ انسان ہی دنیا کی عظیم ترین تخلیق ہے۔"

اس جواب کے رد عمل میں وہ شور برپا ہوا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ لوگ خوش

ہو رہے تھے۔ اطمینان اور سکون کا بار بار اظہار کر رہے تھے اور کھڑے ہو کر مقررین کی داد دے رہے تھے۔ یوں اس تقریب میں دل چسپی بڑھتی گئی اور اپنے آخری حدود تک آگئی۔ لوگ اب دوسرے راؤنڈ کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں فکر تھی تو صرف اس بات کی کہ نہ جانے دوسرے راؤنڈ کا کیا نتیجہ ہو گا۔

دس پندرہ آدمی کاغذات کا ایک ڈھیر اٹھائے ہال میں داخل ہوئے۔ یہ لوگ ٹیلی پرنٹر، ٹیلی فون اور وایرلیس کے محکموں سے وابستہ اہلکار تھے اور وہ پیغامات لے کر آرہے تھے جو دنیا کے مختلف ملکوں سے شوقین حضرات نے بھیجے تھے۔ سبھی پیغامات کمپیوٹر کو فیڈ کئے گئے۔ اناونسر نے بٹن دبا کر مشین سے ایک اور کارڈ بر آمد کیا۔ کارڈ پر ان سبھی پیغامات کی تلخیص درج تھی۔ اناونسر عبارت پڑھنے لگی۔

"دنیا میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ہزارہا افراد نے ہال کے اندر ہو رہی کارروائی کی کھل کر داد دی ہے۔ کئی ایک نے مجھ سے روبرو ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ یہ اور کئی ایک ایسے بھی دل پھینک ہیں جو مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

اس بات پر ہال میں قہقہے بکھرنے لگے۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی "ان بے شمار عاشقان کا میں شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ میری ان سے درخواست ہے کہ یہ لوگ خود ہی غور فرمائیں کہ میں کہاں ان سبھی سے شادی کر سکتی ہوں۔ بہتر ہے کہ وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔" اس پر پھر ایک بار قہقہے بلند ہونے لگے۔

"دوسرا راؤنڈ شروع ہونے جارہا ہے۔ یہ راؤنڈ پہلے سے زیادہ مشکل اور دلچسپ ثابت ہو گا۔ ہمیں چاہیے کہ بغیر کسی رُکاوٹ کے اس راؤنڈ کو بھی مکمل ہونے دیں۔"

کمپیوٹر کی آنکھ سے پھر ایک بار روشنی کی لہر خارج ہوئی۔ ساتوں کرسیوں کو منور کرنے کے بعد روشنی ایک شخص پر جم گئی۔ یہ صاحب سائینس داں تھے۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر وہ مائیکروفون پر آئے اور بولتے رہے۔ وہ کسی اور زبان میں بول رہے تھے جو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ البتہ کمپیوٹر کی سوئی برابر حرکت میں تھی۔ سوئی کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ سوئی آٹھ تک آگئی تھی اور اب کسی طور آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ مقرر نے تھک کر ہار مان لی اور اپنی کرسی پر واپس آگیا۔

اب روشنی کی لہر ایک اور شخص پر پڑی، چنانچہ کھڑے ہو کر انہوں نے بھی اپنا بیان

دیا۔ یہ صاحب فلسفی تھے۔ ان کا سر بالوں سے خالی تھا اور گال پچک گئے تھے۔ وہ ہاتھ ہلا کر اور سر گھما پھرا کر بات کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ کمپیوٹر کو قایل کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ کمپیوٹر کی سوئی گھومتی رہی ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات۔ آٹھ۔ نو۔ اور نو پر آکر سوئی اچانک ٹھہر گئی۔ وہ صاحب زور دے دے کر بولنے لگے لیکن سوئی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ان کے استدلال کا سوئی پر بالکل کوئی اثر نہ ہو رہا تھا۔ وہ تو جیسے نو پر آکر سو گئی تھی۔

اس کے بعد ایک خاتون پر روشنی کی لہر پڑی۔ یہ بیوٹیشین تھی۔ ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں ہونے کے باوجود بھی سولہ سال کی دوشیزہ لگ رہی تھی۔ خوبصورتی سے متعلق تمام امور اس نے ازبر کر لئے تھے۔ وہ بہت ہی دل چسپ انداز میں بول رہی تھی جس سے کمپیوٹر بھی متاثر ہو رہا تھا اور سوئی برابر گھوم رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک ہندسہ پیچھے چھوڑتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن آٹھ اور نو کے درمیان میں اچانک ٹھہر گئی۔ یوں رُک گئی کہ آگے بڑھنے کا نام نہ لیا۔ مایوس ہو کر یہ خاتون خاموش ہو گئی۔

ایک ایک کر کے تمام مندوبین پر روشنی کی لہر پڑتی گئی۔ ایک ایک کر کے وہ سبھی اُٹھتے گئے اور بولتے گئے۔ لیکن سوئی کسی طور نو سے آگے نہ بڑھی۔ لگتا تھا کہ صفر کا ہندسہ ان سبھی مقررین کا مضحکہ اڑا رہا ہے۔ چنانچہ تمام سامعین بددل ہونے لگے۔ ان کی دلچسپی ختم ہو رہی تھی۔ وہ گم صم تھے اور حیران۔

لیکن اب بھی ایک شخص کی تقریر باقی تھی۔ لیکن ان صاحب سے بہت کم لوگوں کو توقعات وابستہ تھیں۔ لوگ سوچ رہے تھے کہ کہاں اتنے وجیہہ اور کہاں یہ منحنی سا آدمی؟ شکل سے وہ کارٹون لگ رہا تھا۔ یوں جیسے چارلی چیپلین، نیا جنم لے کر ہال میں وارد ہو رہا ہو۔ بالکل وہی مونچھیں اور وہی انداز۔ یہ مزاح نگار تھے۔ اناؤنسر لڑکی ابھی تک اپنے جوبن پر تھی۔ لیکن مزاح نگار کو دیکھ کر وہ بھی اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ بہرحال اُس نے کارروائی کی رسم تو پوری کرنی تھی۔ چنانچہ محفل کے آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے اس نے پورے عزت و احترام کے ساتھ ان صاحب کو بھی مائیک پر آنے کو کہا۔ وہ بولتا گیا اور سوئی گھومتی رہی۔ پہلے سات تک آگئی، پھر رُک گئی۔ لوگ مایوس ہو گئے۔ اچانک اُس نے پانی مانگا۔ لڑکی بڑی بے دلی سے اُٹھی اور جگ میں پانی انڈیل کر گلاس اُس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ غٹاغٹ پانی پی گیا اور منہ پونچھ کر دوبارہ بولنے لگا۔
کمپیوٹر کی سوئی بہت سُست رفتاری سے آگے بڑھنے لگی کشاں کشاں نو پر آگئی۔

لوگ تاہم مطمئن تھے کہ خیر سے یہ شخص بھی نمبر نو پر آ ہی گیا ہے۔ وہ اب اپنی تقریر سمیٹنے کے مراحل میں تھا اور سوئی بے حس و حرکت نو کے ہندسے پر سمٹ گئی تھی۔

اور جونہی اُس نے تقریر ختم کر دی۔۔۔ سوئی جھٹ سے ۔۔ صفر کے ہندسے پر آ گئی۔

ہال میں کہرام مچ گیا۔ لوگ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ وہ جیسے دیوانے ہو گئے تھے۔ ہر طرف شور تھا۔ ایک طوفان بد تمیزی۔ مسرت و شادمانی کی لہریں فضا میں چاروں اور رقصاں تھیں۔ اب تک چھایا ہوا سکوت اچانک ہی درہم برہم ہو گیا تھا اور مسرتوں میں بدل گیا تھا۔

لڑکی کھلکھلاتی ہوئی اسٹیج پر آ گئی اور مائیکروفون ہاتھ میں لے کر بولنے لگی۔

"ان صاحب نے۔ ایسی کیا بات کہہ دی۔ ان کا ۔۔ جواب کیا تھا۔ آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے۔ جاننا چاہتے ہوں گے۔ آپ کا ۔۔ رد عمل۔ فطری ہے۔ واجب ہے۔ اور ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم اس کی تشریح کریں۔ ورنہ یہ تجسس۔ تشنگی خواہ مخواہ فضولیات کے پر پھیلا دے گی۔"

اس بات کی تائید میں پھر سے تالیاں بجنے لگیں۔ لڑکی نے کمپیوٹر کا بٹن آن کیا۔ اور ایک بار پھر سے وہی جملے۔ وہی الفاظ کمپیوٹر پر ابھرنے لگے جو مزاح نگار نے اپنی تقریر میں کہے تھے۔

"۔۔۔ کس کی جرات ہے اپنی زبان اپنے ہاتھوں گدی سے کھینچ کر باہر پھینک دے اور کہے کہ اُس ہستی کا وجود نہیں ہے۔ وہ سب سے بڑی طاقت کہلاتی ہے۔ شکتی۔ میرا ایمان ہے کہ وہی سب کچھ ہے اور میں ۔ بس اُسی کا ظہور ہوں۔ میں اُس عظمت اور طاقت کا قایل ہوں۔ البتہ ۔ کبھی کبھار اُس سے اختلاف بھی کرتا ہوں۔ کئی چیزوں پر مجھے شک بھی گذرتا ہے۔ اگر اُس نے مجھے جنت کا حقدار ٹھہرایا ہو گا تو ضرور سوال کروں گا کہ پتنگ کی ڈور آخر ڈھیلی کیوں پڑ گئی ہے۔ اس کے اندر کون سا سُقم ہے جو ٹھیک نہیں ہو پاتا۔

اور اگر میرے نصیب میں جہنم ہی لکھا ہو گا۔ تب بھی مجھے گلہ نہ ہو گا کیونکہ پھر تو سبھی کچھ جل کر راکھ ہو جائے گا، میری مونچھیں، میرے بال، میرا جسم، میری سوچ۔ یہ سبھی کچھ تو بھسم ہو کر رہے گا۔ اور ایسے میں کسی قسم کا اختلاف بھی نہ رہے گا۔ مجھے اس کا کوئی دُکھ بھی نہ

ہو گا۔ ہاں۔ یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی میں خود سے سوچنے لگتا ہوں کہ جب اُس تخلیق کار کے ہاتھوں قدرت کی سب سے بڑی تخلیق ۔۔۔ یہ کائنات وجود میں آئی، جب سورج، چاند اور تارے چمکنے لگے، سیارے گھومنے لگے۔ جب دھوپ اور چھاؤں وجود میں آگئے۔ دن اور رات کا سلسلہ شروع ہوا، جب موسموں کا بدلنا قرار پا گیا اور لاتعداد جانور ظہور پذیر ہوئے۔ تب وہ بہت خوش ہوا ہو گا۔ بہت اترایا ہو گا اپنے فن کو دیکھ کر۔ اور یہ فریب یہ مایا جال دیکھ دیکھ کر اُس نے اس پر بھی ضرور غور کیا ہو گا کہ میری اس تخلیق کا آخر مدعا و مقصد کیا ہونا چاہیئے ۔۔۔؟؟ اور مُدعا مقصد جاننے کی خاطر اس نے بہت کچھ سوچا ہو گا۔ وہ تھک گیا ہو گا۔ اُس نے چاہا ہو گا کہ تھوڑی دیر کے لیے سستالوں۔۔ اپنی تھکاوٹ دور کرلوں۔۔۔ ہنس لوں۔۔۔ خوش ہولوں۔۔۔ اور اس بنا پر اُس نے کائنات کی تخلیق سے بچی کھچی خمیر سمیٹنا چاہی ہو گی۔ سمیٹ کر اُسی خمیر سے ایک بُت بنایا ہو گا۔ ایک پیکر تراشا ہو گا۔۔۔ کہ جس کا نام انسان ہے۔ اور اُس پیکر کو دیکھ کر وہ پہلی بار ہنس پڑا ہو گا۔۔۔ ہاہاہاہا۔۔۔ اور تب سے اب تک وہ برابر ہنس رہا ہے۔ قہقہے لگا رہا ہے۔ ہاہاہا ہا۔۔۔۔"

اس پر ہر طرف سے قہقہوں کی بارش ہونے لگی، اسٹیج کی روشنیاں جلنے اور بجھنے لگیں۔ ہال کے اندر سبھی لوگ خوب ہنس رہے تھے۔ لڑکی بھی کھلکھلا رہی تھی ہال کی روشنیاں ہنس رہی تھیں۔ اب دم میں سب کچھ منور اور ایک ہی دم میں گھپ اندھیرا۔

قہقہوں کے اسی شور میں ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ اور ایک دم میں پھر سے روشنی ہوئی۔ لیکن اس بار جو روشنی ہوئی تو یہ دیکھ کر سبھی حیران رہ گئے کہ اسٹیج کی ہر چیز جوں کی توں کھڑی تھی۔ البتہ نہ لڑکی تھی اور نہ ہی مزاح نگار۔ لوگوں کی نظریں اُنہیں ہر طرف تلاش کر رہی تھیں۔

کمپیوٹر کی آنکھ یہ سارا منظر حیرانگی سے دیکھ رہی تھی اور صفر کا دائرہ بھی کچھ ایسا ہی انداز لئے اس سارے کھیل کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

بشیر اختر

دھوپ چھاؤں

"سبھی جائے بھاڑ میں، ادھر کے مکانوں کی تو چھتیں ہی نہیں۔"

مُرغا پنجرے سے باہر آیا اور آس پاس کے ماحول کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ دور دور تک کوئی بھی ٹیلہ نظر نہیں آ رہا تھا، نہ ہی کوئی اونچی جگہ جس پر کھڑے ہو کر وہ اطمینان سے بانگ ہی دے دیتا۔

اپنے گاؤں میں اُس کا معمول تھا کہ ڈربے سے نکلتے ہی پاس کا ٹیلہ پھلانگ لیتا تھا۔ ٹیلے سے ہو کر رحیم گولے کی کٹھار اور کٹھار کے اُس پار غفار خان کی رسوئی پر چڑھ دوڑتا تھا اور دونوں پر زور زور سے پھڑ پھڑانے کے بعد سریلی سی بانگ دیتا تھا۔ بانگ دینا ہی اُس کی عادت تھی۔ جب بھی اُس کا ڈربہ کھول دیا جاتا، وہ بانگ دیتا تھا۔ جب بھی اُس کا من کرتا تھا وہ ترنگ میں آ کر بانگ دینا شروع کر دیتا تھا۔

اُس کی بانگ سبھی کو یاد تھی۔ چھوٹوں اور بڑوں کو، مردوں اور عورتوں کو، پرندوں اور چوپایوں کو۔ گاؤں کے دست کار اور کاشت کار مُرغے کی بانگ سے پوری طرح واقف تھے۔ اُس کی یہ بانگ جب مشرق میں پھیلے پہاڑوں سے ٹکرا جاتی تھی، ان کی چوٹیوں پر لالی سی دوڑ جاتی تھی۔ حیا کی لالی نئی نویلی دُلہن کے چہرے پر چھا جاتی ہے اور تب کہیں جا کر دولہے کی سی دھج لئے سورج نکل آتا ہے۔ مُرغے کی بانگ کو گاؤں میں کھڑے بیدزار بھی خوب پہچانتے تھے۔ سورج کی کرنوں کو دیکھتے ہی دیکھتے ان کی ٹہنیوں پر پرندے بیٹھ جاتے تھے اور گانے لگتے تھے۔ گاؤں کی عورتیں ندی کنارے مٹی کی گاگریں اور تانبے کے مٹکے اپنی چوڑیوں سے رگڑ رگڑ کر بجانا شروع کر دیتی تھیں۔ بچے بانگ سنتے تھے، ایک دم بستے سنبھال کر اسکول کی طرف دوڑ جاتے تھے۔

بانگ سنتے ہی گاؤں کی مُرغیاں اپنا آنگن چھوڑ دیتی تھیں۔ وہ دوڑ کر جاتیں اور ٹیلہ پھلانگ کر مُرغے کے ارد گرد جمع ہونا شروع کر دیتی تھیں۔

پر آج کے دن جب وہ ایک اجنبی جگہ دیکھ کر پنجرے سے باہر آگیا، مبہوت ہو کر رہ گیا۔ یہاں نہ تو کوئی ٹیلہ تھا نہ منڈیر۔ مکان تھے تو سہی، لیکن ان کی چھت ہی غائب تھی۔ اُسے یاد آیا کہ اب سے دُور اُس کے گاؤں میں ایک بار آگ لگی تھی۔ مکانوں کی کچھ ایسی دُرگت ہو گئی تھی کہ ہر عمارت پانی سے شرابور ہو رہی تھی۔ نہ کہیں چھت، نہ چھجہ، دیواریں تھیں کہ گرنے کو تیار۔ ان کی دراڑوں سے مٹی بہہ بہہ کر باہر آرہی تھی اور اس کی ہر اینٹ گھُل گئی تھی۔

مُرغے نے محسوس کیا کہ آس پاس کے فضاؤں میں کسی قدر نمی اب بھی باقی تھی اور ایسے میں ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آگیا۔ اُسے فوراُ سردی کا خیال آگیا۔ اُس نے ایک دم میں اپنے پر پھلالئے۔ لیکن پر پھلانے پر معلوم ہوا کہ یہ وہ سردی تھی ہی نہیں جو اُس کے گاؤں میں پڑتی رہتی تھی۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ آس پاس کی ساری زمین گیلی تھی۔ دور تک دو ایک گھڑے بھی تھے جن میں پانی بھر گیا تھا۔ شاید ان میں بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا۔ ساری نشانیاں رات میں ہوئی بارش کا پتہ دیتی تھیں۔۔۔۔ لیکن سردی؟؟

اپنے گاؤں میں اُس کی عادت تھی کہ بھری دوپہری میں وہ راکھ کے ڈھیر پر بیٹھ جایا کرتا تھا اور وہیں سے ہو کر کے ڈاروں کے ساگ زار میں کود جایا کرتا تھا۔ تپتی دوپہری میں سارے ساگ زار پر سفیدوں کے سایے لہرانے لگتے تھے اور یہی وقت تھا کہ جب مہری برآمدے میں بیٹھی شام کے کھانے کی خاطر سبزی صاف کرتی تھی۔ مُرغا ساگ زار میں کود جانے سے قبل بانگ ضروری سمجھتا تھا۔ ایک بہادر سپاہی کی طرح، جو دشمن پر حملہ کرنے سے پہلے اُسے ہوشیار کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ اور اُسے اپنے دفاع کا پورا موقعہ فراہم کرتا ہے، مہری اگر موجود ہوتی تو مُرغے کی بانگ سنتے ہی بغیر کچھ کہے ساگ کے پتے مُرغے کے آگے رکھ دیتی اور یوں گھر آئے مہمان کی پوری طرح خاطر تواضع کرتی تھی۔ البتہ مہری کو غائب پاکر مُرغا کچی دیوار پر چڑھ دوڑتا تھا اور وہیں سے رسوئی گھر میں جھانکنے لگ جاتا تھا اور زور زور سے بانگ دینے لگ جاتا تھا۔ ایسے میں مہری کے لیے کھڑا ہونا بھی ایک مصیبت تھا۔ اُس کی بوڑھی ہڈیاں چٹخنے لگ جاتی تھیں۔ اُن میں سے درد ٹیسیں اُٹھنے لگتی تھیں۔ چارونا چار وہ اُٹھ جاتی تھی کیونکہ جانتی تھی کہ نہ اُٹھنے کی صورت میں یہ موا ساگ زار میں کود کر سارے پودوں پر تباہی پھیلا دے گا۔ وہ اسے کوسنے لگتی

"تیری بوٹیاں کتے کھا جائیں۔ تیری ہڈیاں بلی نوچے۔ ارے او رشیدے۔ آ کے اس نا ہنجار پر ایک پتھر مار دے۔"

لیکن مُرغا خوب جانتا تھا کہ مہری کی یہ ساری بکواس محض اُس کا زبانی جمع خرچ ہے۔ وہ خوب واقف تھا کہ بھری دوپہری کی اس گرمی میں رشید اسکول میں بیٹھا ماسٹر جی کی مار کھا رہا ہوگا اور رشیدے کی غیر حاضری میں کسی کی جُرات نہ تھی کہ مُرغے کو ڈانٹ بھی سکے۔ اُسے یاد آیا کہ ایک روز محلّے کے کسی بچے نے غلطی سے مُرغے پر پتھر دے مارا تھا۔ جو اس کے معدے کو چیر گیا تھا۔ بس پھر کیا تھا، مہری لال پیلی ہو گئی تھی۔ اُس نے بیچارے بچے کو ڈانٹ پلائی تھی۔

"بتاؤ بھلا۔ اس مُرغے نے آخر تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔ ارے۔ ساگ نوچتا ہے تو میرے ساگ زار کا۔ تمہارے گھر کی ہانڈی میں اُس نے کون سے پتھر توڑ دئے ہیں جو اس کے پیچھے پڑے ہو۔۔۔ نہیں تو۔۔۔"

اس کے بعد کا تماشہ تو دیکھنے کے لائق تھا، مہری ہی دُلار سے مُرغے کا ایک ایک پر ٹٹولتی رہی۔ محلّے کے بچے چلوؤں میں پانی بھر بھر کر لانے لگے تھے اور مُرغے کو پلانے لگے تھے۔

ایک آہ بھرتا ہوا مُرغا پنجرے کے گرد گھومنے لگا۔ آس پاس جتنے بھی مُرغ تھے سب کے سب اپنے پروں میں سر چھپائے یا تو خاموش کھڑے تھے، یا اونگھ رہے تھے۔ چند ایک زمین کے اندر چھپے خزانوں کی تلاش میں سرگرداں تھے اور کھرچ کر ریت کے ذرّوں کو ٹٹول رہے تھے۔ دور ایک کونے میں ایک کاہل طبع مُرغ بیٹھا بیمار لگ رہا تھا۔ وہ شاید سو گیا تھا۔ جانے کیوں ایک خوبصورت سی مُرغی اس کے گرد چکر لگا رہی تھی اور وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ مُرغا یہ نظارہ دیکھتے ہی بد دل ہو گیا۔ اُسے یاد آیا کہ اپنے گاؤں میں وہ جونہی ڈربے سے باہر آتا، اس کے دائیں بائیں مُرغیوں کی لائین لگ جاتی تھی۔ ہر مُرغی اُس کے ایک اشارے کی منتظر ہوتی تھی۔ اس کا اشارہ پاتے ہی چار چار مُرغیاں اکٹھے دوڑ پڑتی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ دوسرے مُرغ اس سے جلتے بھی تھے۔ لیکن اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

اور آج اس نے ایک اجنبی جگہ پر بہت ساری نسلوں کی مُرغ ایک ساتھ دیکھ لئے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ سراسیمہ ہو گیا تھا۔ ان کی عجیب سے شکلیں تھیں۔ کئی ایسے بھی تھے کہ جن کی گردن میں بال ہی نہیں تھے۔ کئی ایک نُچے ہوئے پرندے لگ رہے تھے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے کہ سروں پر کلغی کے بجائے گوشت کا بڑا سا لوتھڑا لئے گھوم رہے تھے۔ کچھ اتنے لمبے

تھے کہ گردن لمبی کر کے بینگن کے پودے کے آرپار نظر اُٹھا کر دیکھ سکتے تھے۔ اور ایک اس قدر موٹا تھا کہ مُرغا اس کا جثہ دیکھ کر من ہی من مسکرا دیا۔

"اتنا موٹاپا کسی بھی کام کا نہیں۔" مُرغا سوچنے لگا "اپنا بھاری بھرکم جسم لے کر یہ نہ تو دیوار پھاند سکتا ہے اور نہ دوڑ سکتا ہے۔ اور نہ ہی اس کے مٹکے جیسے پیٹ سے اس کی آواز باہر آسکتی ہے۔"

مُرغے کو یاد آیا کہ اپنے گاؤں میں وہ دیوار پھاند کر مہری کے رسوئی گھر میں جھانکنے لگ جاتا۔ رشیدا اس کی ٹانگوں کا نشانہ باندھ کر ٹھیکری مارتا تھا۔ لیکن ٹھیکری کے آتے ہی مُرغا جھٹ سے اپنی ٹانگیں سمیٹ کر یوں پھلانگ جاتا تھا کہ ٹھیکری پاؤں کے نیچے سے نکل کر دور جا گرتی تھی۔ ٹھیکری کے نکلتے ہی اس کی ٹانگیں واپس اپنی اصلی حالت پر آجاتی تھیں۔

"کیا دن تھے وہ بھی۔" مُرغا سوچتا "وہ تماشا دیکھنے کی خاطر گھر کی عورتیں کھڑکیوں سے جھانکنے لگ جاتی تھیں۔ اور رشیدے سے یہ کرتب بار بار دُہرانے کی فرمائشیں کرتیں۔ بچے تالی بجا بجا کر مُرغے کو شاباشی دیتے تھے۔ یوں جیسے وہ مداری کے کرتب دیکھ کر کرتے ہیں۔ کھیل ختم ہوتے ہی مُرغے کے آگے چاولوں کے ڈھیر لگ جاتے تھے۔ دھان، چاول، روٹی، اور بھات۔

اب تو یہ کسی کو بھی یاد نہ ہوگا کہ اُس گاؤں پر کیا بیتی۔ اُس گھر پر کونسی آفت نازل ہوئی جہاں یہ مُرغا رہتا تھا۔ وثوق سے تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ آیا گھر والوں کی نیت میں فتور آیا تھا۔ مُرغ کو تو بس یہ یاد تھا کہ اُس روز شام کے وقت حسب معمول ڈربے کی اُور جا رہا تھا کہ ایک بلائے ناگہانی نے اُسے اچانک جکڑ لیا تھا۔ اُس نے چیخنے اور چلانے کی بہت کوشش کی تھی اور جب اُس نے گھر کی مالکن کو دیکھا، اُس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ وہ بہت ہی رازداری سے اُس شخص سے باتیں کر رہی تھی کہ جس نے مرغ کو باندھ لیا تھا۔ بڑی لاچارگی سے مُرغ نے گھر کی مالکن کو دیکھا لیکن دامن جھٹک کر وہ گھر کے اندر چلی گئی تھی۔ اور واپس نہ نکلی تھی۔ دونوں ٹانگیں جکڑ کر مُرغے کے پر بھی کتر دئے گئے اور یوں پنجرے میں پھینک دیا گیا۔

جب تک کہ دن کا اُجالا تھا، مُرغا وہ سارے راستے دیکھ چکا تھا کہ جن راستوں سے ہو کر اُس کا پنجرہ گذرا تھا۔ پنجرے میں بیٹھے بیٹھے ہی اُس نے پہاڑ عبور کئے تھے، ندیاں پار کر لی تھیں لیکن اندھیرا پھیلنے کے بعد وہ کچھ بھی نہ دیکھ پایا تھا۔ صرف ہوائیں تھیں جو راستے بھر شوں شوں کرتی چلی جا رہی تھیں۔ اور جس وقت پنجرہ کھول دیا گیا، مُرغا آس پاس کے مناظر دیکھ کر

بوکھلا گیا تھا۔ یہاں نہ پیڑ تھے نہ راکھ کے ڈھیر۔ مکانوں کی چھت سے تو گھاس بھی لٹک نہیں رہی تھی۔ اور نہ ہی کہیں ٹھٹھار تھے۔ عمارتیں تھیں کہ ننگے سر گھومتی دیہاتنیں لگ رہی تھیں کہ جن کے کانوں میں بُندے تو ضرور تھے لیکن سر پر ٹوپی ندارد تھی۔

ایک روز مُرغے کی جان میں جان آئی جب اُس نے دیکھا پنجرے سے تھوڑی ہی دور ایک جھنڈ میں اُس کا ایک جان پہچان کا مُرغا کھڑا تھا۔ اُس نے آنکھیں میچ کر اُسے دیکھا اور یقین ہو گیا کہ ضرور وہی مُرغا ہے جسے وہ اکثر گاؤں کی مرغیوں کے ساتھ عشق لڑاتے بارہا دیکھ چکا تھا۔ البتہ اس قدر بزدل کے دوسرے کو دیکھتے ہی راستہ بدل دیتا تھا۔ اور شریف زادہ بنتا تھا۔ اُس کی بُزدلی پر محلے کے مرغ اُس پر آوازے بھی کستے تھے۔ اشاروں کنایوں سے تانے دے کر اُس کی غیرت کو للکارتے تھے۔ اُس کی ساتھ والی مرغیوں کو چھیڑتے رہتے تھے لیکن یہ نا ہنجار مٹی کا مادھو، چپ سادھ لیتا تھا۔ کبھی اُس کی غیرت نہ جاگی، اتنی بھی توفیق نہ ہوئی کہ اپنی گردن کے اردگرد لگی خوبصورت کلغی کے پر ہی کھول دے۔ ظاہر ہے کہ سبھی اس سے بدظن تھے، وہ اس سے دور رہتے تھے کیونکہ یہ ننگ اسلاف تھا۔

لیکن آج کے دن جب اُسی مرغ کو ایک اجنبی جگہ پر دیکھا گیا، مُرغے کی رگِ حمیت ایک دم جاگ اُٹھی۔ اس کا اپنا پن بیدار ہوا۔ چنانچہ اپنی ٹانگ سے دایاں پر مسلتے ہوئے وہ اس کے قریب گیا۔ اور بڑے ہی دُلار سے اُس کے گرد کئی چکر لگائے۔ بالکل اُسی انداز میں کہ جس انداز میں وہ محلے کی مرغیوں کے گرد چکر لگایا کرتا تھا۔ نہ معلوم کیوں وہ اس پر بھی مُلتفت نہ ہوا۔ اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مُرغا چڑ گیا اور اُس کی گردن پر زور سے چونچ ماردی۔ اُس کے کئی پر ہوا میں اُڑتے رہے لیکن وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ نہ کچھ بولا، نہ پر کھول دئے نہ گردن تانی اور نہ ہی کلغی گھمائی۔ زچ ہو کر مُرغا اُسے چمکارنے لگا۔ لیکن بے سود، مُرغا شرمسار ہو کر اپنے آس پاس کی مُرغیوں کو دیکھنے لگا وہ سبھی ان دونوں سے بے نیاز پروں میں منہ دئے اونگھ رہی تھی۔ حالانکہ پنجرے سے بس تھوڑی ہی دور ایک لمبا سبزہ زار دور تک پھیلا ہوا تھا جہاں اونچی اونچی گھاس تھی اور سرسبز پتے۔ وہی پتے جو مہری کے ساگ زار میں اُگتے تھے۔ اُس کا جی چاہا کہ جا کر ان سارے پتوں کو اُسی طرح مسل دے گا جیسے وہ گاؤں میں انار کی ڈالیوں کے پتے چونچ مار مار کر مسل دیا کرتا تھا۔

وہ بھی کیا چھاؤں تھی۔ اُسے یاد آیا کہ جھلستی گرمی میں دھوپ کی تمازت سے گھبرا کر

سارے مُرغ انار کی ڈالیوں میں چھپ جایا کرتے تھے۔ انار کے اُن پیڑوں میں بہت ساری ڈالیاں تھیں جو ایک دوسرے کے ساتھ گڑ مڑ ہو کر رہ گئی تھیں اور ان میں سینکڑوں پتے اُگ آئے تھے۔ ڈالیاں اس قدر گھنی تھیں کہ پورا آدمی ان میں اچھی طرح چھپ سکتا تھا۔ سارے مُرغ ان ہی ڈالیوں کے اندر دُبک جایا کرتے تھے اور یوں دھوپ کی تمازت سے بچتے تھے۔ دوپہر کے بعد جب گاؤں کی لڑکیاں کھانے کے برتن صاف کرنے کی غرض سے دریا کنارے جمع ہوتی تھیں تو برتنوں کی کھنک کے ساتھ ہی سارے مُرغ ان ڈالیوں سے کود پڑتے تھے۔ دیوانے بندروں کی طرح۔ ایک ساتھ اُڑان بھر کر مُرغ اور مُرغیوں کا یہ جھُنڈ ندی کنارے ڈیرا ڈالتا تھا۔ ان کی اُڑان دیکھ کر اونچے درختوں میں بیٹھے پرندے ڈر کر بھاگ جایا کرتے تھے اور سارے آسمان میں دور دور تک پھیل جاتے تھے۔

"کیا سماں تھا وہ بھی" مُرغ نے آہ بھری۔ پروں کے شور سے جانور بھی بدکتے تھے لیکن آدمی اور ان کے بچے خوش ہو کر تالی بجاتے تھے۔ عورتیں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتی تھیں۔

اور آج اس اجنبی جگہ پر سبزے کی حکمرانی ہی تھی لیکن پنجرے سے باہر۔ اور پنجرے کے اندر کے باسی ان سبزہ زاروں سے لاتعلق آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھے بنے پھر رہے تھے۔ ان کی نظریں تو بس پنجرے کے اندر پڑی ناند پر جمی ہوئی تھیں جس میں صرف بھوسہ رکھا ہوا تھا۔ اور یہ بے وقوف عادت سے مجبور چونچ مار مار کر اُسے بکھیر کر رکھ دیتے تھے۔ شاید یہی اب ان کی زندگی تھی۔ مُرغا سوچ میں پڑ گیا اور پنجرے کی ہر چیز کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ اُڑ کر طاق میں رکھے اناج کے ڈبے پر چڑھ کر دوڑا۔ اُس پر کھڑے ہو کر زور زور سے دونوں پر ہلائے اور اس کے بعد باہر کی طرف اُڑان بھری۔ اس کا اندازہ تھا کہ ایک ہی اُڑان میں وہ پنجرہ چھوڑ کر باہر سبزہ زار میں اُترے گا وہاں زمین چھُپے کیچوؤں کی خوب خبر لے گا۔ یہ کہاں معلوم تھا کہ پنجرے میں جالی لگی ہے۔ جالی کے آر پار نظر جانے کے باوجود بھی اس کے سوراخوں کے بیچ سے پورا جسم گزارنا آسان نہیں۔ وہ زور سے جالی سے ٹکرایا۔ ٹکرا کر گر گیا۔ گرا بھی تو ایسے اُس کا دایاں پنکھ جال کے ایک سوراخ میں پھنس کر رہ گیا۔ اس کے کئی پر اُڑ گئے۔ پنکھ کے چھوٹتے ہی وہ دھپ سے زمین پر آگرا۔ زور کی چوٹ لگی۔ چوٹ لگتے ہی منہ سے بے اختیار کُرت کی آواز نکل گئی۔

اس کے کُرت کی آواز کافی لمبی تھی اور دردناک، پُر اسرار تھی اور اچانک بھی۔ کُرت

کی یہ آواز جب مُرغیوں کے کانوں میں گئی ان کے چہروں پر مُردنی چھاگئی۔ مُرغ خوفزدہ ہو کر چھت کو گھورتے رہے۔

کُرت کی آواز کے ساتھ ہی پنجرے کے باہر عجیب طرح کی مخلوق جمع ہو گئی تھی۔ وہ سچ مچ کی بلائیں تھیں کہ جن کے چہرے خوفناک تھے۔ ان میں بلیاں تھیں کہ جن کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ ان میں بھیڑیے تھے کہ جن کے منہ کُھلے ہوئے تھے۔ ان سے پرے آندھی سے بھی تیز دوڑنے والی لومڑیاں تھیں۔ ہر پل اپنا رنگ بدلنے والے کیڑے تھے۔ یہ سبھی تو کُرت کی آواز کے ساتھ ہی پنجرے کے قریب آگئے تھے اور اب منہ سے خوفناک اور ڈراونی آوازیں نکال نکال کر مُرغیوں کو ڈرار ہے تھے۔ لیکن مرغیاں؟۔۔ وہ سبھی ان کی ڈراونی آواز سے لاتعلق صرف اونگھنے میں مصروف تھیں۔ اور مُرغ ناند میں چونچیں مارنے میں مگن۔

مُرغ کے دل میں کئی بار یہ خیال آیا کہ ایک ایک کے پاس جاکر اُس سے اس کی بے حسی کی وجہ پوچھے گا۔ اسے غیرت دلادے گا۔ اس کے خون میں جوش بھر دے گا۔ لیکن یوں جیسے کوئی ننگ دھڑنگ فقیر۔

پھر یوں ہوا کہ دن بیت گئے۔ مہینے بیت گئے اور سال بیت گئے۔ جب کبھی بھی مُرغ نے اپنے پر کھولنے کی سوچی، ایک دم ساری بلائیں عود کر آئیں۔ اندھیرے میں دئے سے روشن ہونے لگے۔ ایک یا دو نہیں بلکہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں دئے۔ لیکن مرغ اس بات سے پوری طرح واقف تھا کہ دئے سچ مچ کے دئے نہیں بلکہ آوارہ کتوں کی آنکھیں ہیں جو اندھیرے ہی میں چمکتی ہیں۔ چنانچہ اُس نے پنجرے کے اور باسیوں کی طرح ان چمکتی اور خوفناک آنکھوں سے سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا تھا۔ حالانکہ چمکتی آنکھوں کا مقصد اُسے کبھی نہ معلوم ہو سکا تھا۔ وہ تو بس اوروں کی طرح اپنے ماحول سے لاتعلق ہو گیا تھا۔ اور ناند میں پڑے چاولوں پر گزارہ کرنے کی اُسے عادت پڑنے لگی تھی۔ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ پنجرے سے باہر بھی ایک دُنیا ہے جہاں سبزہ اُگتا ہے، سبزے میں کیچوے رینگتے ہیں۔ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ اب بھی اُڑان بھر سکتا ہے۔ ساگ زار میں گھوم پھر سکتا ہے نوچ بھی سکتا ہے۔ اپنے گاؤں کی مُرغیوں۔۔۔۔

پھر ایک روز پنجرے کا دروازہ کُھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی مُرغے کے پنکھ اچانک کسمسائے۔ ان میں حرارت پھیل گئی۔ اُس نے پر کھول دئے۔ اُڑان بھری اور ایک ہی جست میں پنجرے سے باہر کھڑی دیوار پر چڑھ گیا۔ اپنی گردن اُٹھا کر اُس نے لمبی سی بانگ دے دی۔ یہ بانگ

درختوں میں بیٹھے پرندوں کے کانوں میں گئی اور ان میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک جُٹ ہو کر وہ چہچہانے لگے۔ یہ بانگ ساگ زاروں کے پتوں سے ٹکرائے اور ان پر شبنم کے موتی خوشی کے آنسوؤں کی مانند کھکھلا اُٹھے۔ پھولوں نے بانگ سُنتے ہی خوشبو بکھیر دی۔ ہوائیں جو ابھی تک آہستہ روی اختیار کئے ہوئے تھیں، مُرغے کی بانگ سنتے ہی اپنی رفتار بڑھا گئیں۔ اتنی تیز رفتار کہ ہوا سے وہ آندھی بن گئی۔ زور کی آندھی۔

پھر یوں ہوا کہ جنگل سے اُتر کر بستی کی طرف آئی۔ اس کے بستی میں گھُستے ہے ہی گلیوں سے دھول اڑنے لگی۔ دُھول کی بنا پر لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں جالے بُننے لگے۔ آندھی پہاڑوں کی چوٹیوں سے ٹکرائی اور وہاں سے بڑے بڑے پتھر لڑھکا دیئے۔ لڑھک کر پتھروں کا سُرمہ بن گیا۔ سُرمہ دھول کے ساتھ اُڑا اور پنجرے کے اندر پڑی ناند میں گرا۔ ناند میں گر کر وہ بھوسے کے ساتھ مل گیا۔ یہ سُرما اناج کے دانوں کے ساتھ مُرغ نے چُگ لیا۔ سُرمہ چُگنے سے اُس کا گلا بیٹھ گیا۔

وہ دن ہے اور آج کا دن، مُرغ اب بانگ نہیں دیتا۔ اب اُس کے تصور میں بھی نہیں کہ کبھی وہ بانگ بھی دے سکتا تھا۔

سب سے عجیب بات ہے کہ بانگ سُننا اب کسی کو بھی پسند نہیں۔

بنسی مزدوش

گرداب

بارش زوروں پر تھی اور رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب کے زمین اور آسمان کا آپس میں ملن ہو کر ہی رہے گا۔

ہر کرشن سر تاپا بھیگ گیا تھا۔ کوٹ، پتلون، قمیض، یہاں تک کے اُس کے موزے بھی بھیگ گئے تھے۔ ندی کے اُس پار کے کشتی بان کب کے سو چکے لگ رہے تھے اور ایسے میں اُس کی آواز کسی کے کانوں تک جانے نہ پا رہی تھی۔

"ارے بھئی ندی پار کرا دو۔" آواز بار بار واپس آ رہی تھی۔ آخر تھک ہار کر اُس نے قادر ملاح کو اُس کا نام لے کر پکارا۔

"قادر۔۔ارے او قادرا۔ ندی پار کرا دو"، اب کے جو اُس پار سے قادر ملاح کی آواز آئی، ہری کرشن کی جان میں جان آئی۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں اس بار بھی اگر اُس کی پُکار قادر ملاح کے کانوں تک نہ گئی تو ناحق اُسے گھاٹ ٹیڑی میڑھی سیڑھیاں پھلانگ کر واپس جانا ہوگا اور سڑک سے ہوتے ہوئے پُل پار کر کے گھر پہنچنا ہوگا۔ لیکن یہاں سے گھر تک جانا بھی کارے دارد والا معاملہ تھا۔ سردی کی وجہ سے اُس کے دانت بج رہے تھے۔ جسم میں کپکپی طاری تھی۔ پُل تک جاتے بارش میں جم کر رہ جانے کا خوف تھا۔ اب ایک آس باقی تھی کہ کہیں سے کشتی مل جاتی تو جلدی گھر پہنچ جاتا۔ قادر ملاح کی آواز آئی اچانک بدن میں گرمی سی پھیل گئی۔ بے حس ٹانگوں میں طاقت آنے لگی اور مریل سی آواز میں گونج پیدا ہو گئی۔

"بھئی جلدی کر۔ میں بُری طرح بھیگ گیا ہوں۔ آدھے گھنٹے سے کھڑا ہوں۔"

قادر ملاح نے کشتی کھول دی اور چپو چلاتا ہوا بیوی سے کہنے لگا "تم میرے برتن میں بھی بھات پروس کر رکھ دو اور خود کا کھانا شروع کر دو۔" اس وجہ سے ناک کی سیدھ میں کشتی

لے جانا مشکل تھا۔

"تم کشتی کو زور سے پکڑ کر رکھو۔ یہاں پورا گھاٹ لگتا ہے پھسل رہا ہے۔"

"اُترو بھئی کسی طرح۔ یہاں لوگ طوفانوں سے لڑ جاتے ہیں اور تم ہو کہ کنارے پر کھڑے ہو کر بھی گھبرا رہے۔ ہاں شاباش۔ اب کشتی کے اندر آجاؤ۔ دیکھو پاؤں سنبھال کے رکھنا۔"

ہری کرشن کی اصل آواز اب تک کہیں کھو گئی تھی۔ وہ بولا

"میرے ہاتھ پاؤں میں ہوش کہاں بھئی۔ میں تو پورا بھیگ چکا ہوں۔" قادر ملاح نے ایک دم اس کی آواز پہچان لی۔ وہ حیران ہو کر چلایا۔

"ارے یہ تم ہو ہری کرشن۔ میری توبہ۔ ارے یہ تم کہاں سے ٹپک پڑے اس وقت؟"

"ہاں یہ میں ہی ہوں۔ ہری کرشن۔ میرے سوا کون ہوتا جو تم کو اتنی رات گئے نام لے لے کر پُکارتا۔ اب تو تمہیں میری آواز بھی یاد نہیں۔"

قادر ملاح کشتی کھینے لگا اور بولا۔ "تیری بھابھی کو شک تو پڑ گیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ ضرور ماسٹر جی کی ہی آواز ہے۔ لیکن میں بولا کہ تم کہاں اس وقت اتنی رات گئے، برستی بارش میں۔ چنانچہ میں ہی ٹال گیا تھا پھر سوچا کہ کوئی مصیبت کا مارا ہوگا جو رات گئے پھنس گیا ہے۔ لیکن تم کہاں گئے تھے؟"

ہری کرشن کو اس بات پر تاؤ آگیا اور بولا "جاتا کہاں بھائی۔ بس جان پر بن آئی تھی۔" اُسے اب اپنے آپ پر بھی غصہ آنے لگا تھا۔ لیکن قادر ملاح جواب میں شوخی سے بولا۔

"ارے تیری تو نسیں بھی خشک ہو چکی ہیں۔ پیٹ خالی ہے کیا؟ منہ سے آواز ہی نہیں نکل رہی ہے۔"

"دیکھ تو میری حالت۔ جیسے کپڑوں سمیت دریا بُرد کر دیا گیا ہوں۔"

"ہاں ہاں دیکھ رہا ہوں۔ آسمان سے تو لگتا ہے کہ بلائیں نازل ہو رہی ہیں۔ میں خود بھی پریشان ہوں۔ پانی تمہاری دیوار تک آگیا ہے۔"

"آنگن میں تو نہیں جائے گا۔" ہری کرشن ڈر کر بول اُٹھا۔

"نہیں ابھی پانی میں اتنا زور نہیں ہے۔ پھر بھی کیا کہا جاسکتا ہے۔ اگر اسی رفتار سے ساری رات بارش ہوتی رہی، تو ضرور کل صبح کا میرا ڈونگہ تمہارے آنگن میں بندھا ہوگا۔۔ تمہیں وہ دن یاد ہیں۔"

"ہاں پوری طرح یاد ہیں۔" ہری کرشن بولا "لیکن وہ لڑکپن کی باتیں ہیں۔ ندی میں باڑھ آئی تھی۔ میں کھڑکی میں بیٹھ جاتا تھا۔ قادر ملاح کو اپنے لڑکپن کی یاد آگئی اور بولا "تمہارے مکان کی گلی میں اندر تک ناو لے جاتا تھا۔ بھئی۔ کیا دن وہ بھی۔ وہ پیار۔ وہ محبت۔ وہ دن اب کہاں؟ جانے کیوں سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اور آج دیکھو کہ مجھے تمہاری کوئی خبر نہیں اور تم مجھ سے بیگانے۔ جانے کتنے مہینوں بعد ملے ہو اور ایسی حالت میں۔" اُس نے کشتی کنارے لگادی اور ہری کرشن کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

"گھر کے جنجال سے کسی کو فرصت نہیں۔ ہم تو خیر سے جوان کہلائے جاتے ہیں۔ ہمارے بُزرگوں کو دیکھو۔ ان کے پاس بھی اب وقت نہیں۔ کسی سے پوچھو کہ بڑے میاں کی مصروفیت کس چیز کی۔ وہ جواب نہ دے پائے گا۔"

قادر ملاح بولا۔ "اب نہ تو وقت میں برکت ہے اور نہ ہی روپے پیسے میں۔ جسے دیکھو گرفتارِ مصیبت ہے۔ میں ابھی ابھی ڈونگے کے اندر گیا ہوا تھا۔ کھانا اب تک رکھا ہوا پڑا ہے۔ رحتی نے بھی ابھی تک کھایا نہیں ہے۔"

"مصری تو ٹھیک ہے نا" ہری کرشن نے اچانک سوال کیا۔"

وہ اپنے سُسرال میں ہے۔ پچھلے تین مہینوں سے آئی نہیں ہے۔" قادر ملاح فخر سے بولا گویا زندگی کی سب سے بڑی فتح حاصل کر چکا ہو۔

"ارے۔ تم نے بیٹی کو بیاہ دیا ہے کیا؟ اور مجھے خبر ہی نہیں۔ تعجب ہے تمہارے قریب کا ہمسایہ ہوں۔"

"کیا بات کرتے ہو۔" قادر ملاح نے ڈانٹ پلائی "تیری بیٹی ودا شادی میں شریک تھی۔ اور تو کہہ رہا ہے کہ مجھے خبر نہیں۔ خُدا اسلامت رکھے ودا کو رُخصتی تک مصری کے پاس بیٹھی رہی۔ سچ ہے لکھنا پڑھنا کبھی اکارت نہیں جاتا۔ میری بیٹی کو جو تمیز اور طور طریقے اُس نے سکھائے ہیں اُس کے لیے میں اُس کا احسان مند ہوں۔"

ہری کرشن نادم ہوا اور بولا "اور مجھے خبر نہیں۔ گھر کے اندر کسی نے بھی اس بات کا ذکر تک نہ کیا۔ ایک تو مجھے ان سے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں۔ صبح سات بجے اُٹھ کر ٹیوشن کو جاتا ہوں۔ نو بجے واپس آکر کھانا کھاتا ہوں۔ کئی بار وہ بھی ناغہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد اسکول جاتا ہوں۔ شام کو دوبارہ ٹیوشن لیتا ہوں۔ اور یوں رات گئے واپسی ہوتی ہے۔ آج

چونکہ بارش ہو رہی ہے، اسی وجہ سے اس طرف آنکلا ہوں۔ ورنہ پُل سے گذرنا ہوتا ہے۔"

قادر ملاح اس پر طعنہ زن ہوا اور بولا "یہ تو قاعدہ ہے بھئی زندگی کا اصول۔ پیسہ ہی پیسے کو کھینچتا ہے۔ چار آنے کیا مل گئے، اور چار آنے حاصل کرنے کی خاطر آدمی کچھ بھی کرنے پر آمادہ ہے۔"

"نہیں۔ یہ مجبوری ہے۔" ہری کرشن نے صفائی دینا چاہی "یہ سچ ہے کہ آمدنی بڑھ گئی ہے لیکن آمدنی کے ساتھ ساتھ اخراجات بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔ میں چار سو روپے کما کر لاتا ہوں۔ پھر بھی یہ کم پڑتے ہیں۔ اس میں ہمارا پیٹ بھی نہیں بھرتا۔"

"یہ سچ ہے۔" قادر ملاح نے حامی بھر لی۔ اُسے اپنی سختیاں یاد آگئی تھیں۔ چنانچہ بولا "یہاں کون سی چیز سستی ہے۔"

"صرف آدمی۔" ہری کرشن بولا۔ اس کے ہر انگ میں سردی نے گھر کر لیا تھا۔ وہ اب باتوں کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُٹھ کر کشتی سے باہر آگیا۔ قادر ملاح نے کہا "جلدی نہ کر۔ ایک ذرا رُک جا۔ میں کوئی کپڑا لیتا آؤں گا۔ اُسے سر پر لے لینا۔ یہ کہتے ہی اُس نے زور سے رحتی کو پکارا۔

"رحتی۔ رحتی" لیکن لیکن ہری کرشن نے منع کر دیا اور کہا۔

"چھوڑو بھئی۔ اب تو گھر آ ہی گیا ہے۔ بس سات سیڑھیاں پھلانگنی ہیں۔ لو کتنی دور جانا ہے۔ گھر میں سبھی بھوکے ہونگے اور میرے ہی انتظار میں بیٹھے ہونگے۔

"تب جاؤ۔ لیکن احتیاط سے۔ وہ لوگ تمہارے لئے پریشان ہو رہے ہونگے۔"

ہری کرشن دوڑتا ہوا سیڑھیاں پھلانگ گیا اور سڑک پر آگیا۔ آنگن میں داخل ہوتے ہی ذرا دیر کو رُک گیا اور دیکھا کہ دروازہ بند ہے۔ اس میں اندر سے کنڈی لگی تھی۔

مکان کی ساری بتیاں بُجھا دی گئی تھیں۔ ہری کرشن کے کمرے کی بجلی بھی بند تھی۔ اُس نے زور سے کنڈی کھٹکھٹائی۔ لیکن کوئی جواب نہ پایا۔ آخر زور زور سے پکارنے لگا۔

"ماتا جی۔ ماتا جی!!" آنگن میں نل کے نزدیک ہی کُتیا کے پلّے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے جو ہری کرشن کی آواز سُنی تو زور زور سے بھونکنے لگے۔ ہری کرشن کی ماں نے بھی آواز سنی اور ایک دم بستر چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ پنڈت نے روک لیا اور پوچھا۔ "کہاں جا رہی ہو؟"

"یہ شاید کرشن کی آواز ہے۔ ابھی ابھی آیا ہو گا۔" وہ پھر ان سننے لگی۔

"کوئی ہر کرشن نہیں۔ تمہیں کوئی نہیں بُلا رہا۔ تم سو جاؤ۔ اس کی بیوی بھی ہے۔ اندر کمرے میں ہو گی۔ نیچے جا کر اُس کی ٹانگیں ٹوٹ نہیں جائیں گی۔ جا کر خود ہی دروازہ کھول دے گی۔"

"ہائے ہائے۔ کیا اُپکار ہے آپ کا؟" ماتا جی اُٹھنے لگی کہ پنڈت نے پھیرن چھین لیا۔ وہ پھیرن چھڑانے لگی "چھوڑ دو۔ برستی بارش میں چل کر آیا ہو گا۔ اس کو کیسے اس سردی میں خالی پیٹ کھڑا رہنے دوں گی۔"

"واہ کیا ممتا ہے۔ بوڑھی عورت۔ یہ لوگ تو ماں باپ کی صورت سے بھی بیزار ہیں اور تم ہو کہ ان کے واری جا رہی ہو۔ کاش تم میرا بھی اتنا ہی خیال کرتیں۔ کم از کم اپنے شریر کو ہی دیکھ لیتیں۔ اس بڑھاپے میں بھی پانچ پانچ بچے اپنی گود میں اٹھائے پھرتی ہو یہ تو سوچو تم نے ہمیشہ صرف ان کی آیا بن کے رہنا ہے؟" پنڈت کی یہ باتیں ماتا جی کے بدن میں برچھیوں کی طرح چُبھ گئیں۔ وہ بولی۔

"ان کی ماؤں کا کیا ہوا ہے۔ وہ کیوں نہیں انہیں سنبھالتیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ انہیں موج مستی کرنے کی خاطر کھلا چھوڑ دیا جائے؟"

اوپر ہری کرشن کے باپ کی ہڑ بونگ جاری تھی اور نیچے خود ہری کرشن سردی میں زور زور سے چلا رہا تھا۔ بہت دیر بعد گلی کا دروازہ کُھلنے کی آواز آئی۔ ہری کرشن کی بیوی رانی نیچے آ گئی تھی۔ ماتا جی نے دروازہ کُھلنے کی آواز سُنی اور غصے سے بولی۔

"اب چُپ بھی کر لیں۔ رانی اوپر آ رہی ہے۔ اب اگر اس نے آپ کی یہ اوٹ پٹانگ باتیں سُن لیں، بے چاری کا دل ٹوٹ جائے گا۔"

ہری کرشن جھلا گیا تھا اور جھلا کر اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ "بارش اگر نہ ہوتی تو میں اُلٹے قدموں ہی واپس چلا گیا ہوتا۔ آپ کو ناحق تکلیف ہوئی ہو گی۔"

رانی اس پر جل کر بولی "مجھے کہاں تکلیف ہوئی ہے آپ کے گھر میں آج تک، جو مجھ پر الزام دھرتے ہیں۔ گھر کا ہر فرد جانے کب سے نیند کے مزے لے رہا ہے۔"

ہری کرشن اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کے بدن میں کپکپی اب بھی جاری تھی۔ رانی کہہ رہی تھی۔

"آپ کاہے کو یہ طعنے دے رہے ہیں۔ میں سوئی نہیں تھی۔ بس یوں ہی آنکھ لگ گئی

تھی۔ بارش کے شور میں باہر کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اب آپ اپنا غصہ تھوک کر کپڑے بدل دیں۔ یہ بھیگ گئے ہیں۔" وہ ہری کرشن کے کوٹ کے بٹن کھولنے لگی۔ لیکن ہری کرشن نے اُس کے ہاتھ زور سے جھٹک دیا اور کہا "تم ہاتھ مت لگاؤ۔ مجھے بٹن کھولنا آتا ہے"۔

ہری کرشن نے سبھی کپڑے اتار کر رکھ دیے تھے۔ اس کی لنگوٹ سے بھی پانی رِس رہا تھا۔ وہ بولا

"قمیض اور پاجامہ ہے کوئی میرا؟"

دونوں قمیض دھو کر اوپر چھت پر ڈال دی گئی ہیں۔ موسم ہی گیلا ہے۔ ابھی کہاں سوکھی ہونگی۔" رانی کا یہ جواب سن ہری کرشن پر گراں گذرا۔ وہ بولا

"اب کیا پہنوں؟ اپنا سر۔ کیا اپنی ہی کھال اُتار کر دوبارہ پہن لوں۔ کوئی چیتھڑا بھی ہے گھر میں؟"

"جو بھی رکھا ہے۔ وہ کون سا نیا ہے۔" لیکن ہری کرشن نے یہ بات نہ سُنی۔ وہ لحاف کے اندر دُبک گیا تھا۔

"اب کیا ننگے بدن ہی سوئیں گے؟"

"تو کیا کروں۔ مجھے سردی لگی ہے۔ وہ کیا ہے۔ وہ۔ کپڑا؟"

ہری کرشن کھونٹی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا

"میرا جمپر ہے۔" رانی بولی

"تو لے آؤ یہی اُٹھا کر۔ صبح تک کام آئے گا۔ جب تک قمیض بھی سوکھ جائے گی۔"

"ہائے بھگوان۔ آپ جمپر پہن کر سو جائیں گے؟"

"میری شامت۔ اب اٹھا کے دوگی یا یوں ہی بک بک کرتی رہو گی۔

اگر چاہو تو دُری کو بُلا لو۔ میں اُسی کا جمپر پہن لوں گا۔"

"میرا کیا ہے" رانی بولی "جو چاہو پہن لو۔ اگر اجازت دو تو ناتھ جی سے اُس کی قمیض مانگ لوں گی۔" لیکن ناتھ جی کا نام آتے ہیں ہری کرشن کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ بولا۔

"تم سے کتنی بار کہا ہے کہ میں غیروں کے کپڑے نہیں پہنتا۔ میں وہی پہنوں گا جو میری اپنی کمائی سے گھر میں آیا ہو گا۔ ناتھ جی امیر آدمی ہے تو اپنی جگہ۔ وہ کون ہوتا ہے مجھ پر ہمدردی جتانے والا۔" رانی یہ باتیں سُن کر ڈر سی گئی اور بولی

"آپ کا غصہ مجھ پر ہے۔ ناتھ جی کا نام کیوں لے رہے ہیں۔"

"نام میں نے نہیں، تم نے لیا ہے۔ تم اُس کی طرفدار بنی پھرتی ہو۔ جانتا ہوں کہ ناتھ جی کے اندر جو اچھائیاں ہیں۔ وہ مجھ میں میں نام کو بھی نہیں۔ اُس پر ہُن برستا ہے۔ جائزنا جائز کرا کر کے وہ نوٹوں کی گڈیاں گھر میں لے آتا ہے۔ سب اُس سے خوش ہیں۔

اُس کی بہت ساری صفتیں ہیں۔ اُس کا باپ اُس سے خوش ہے۔ ماں خوش ہے۔ اُس کی بیوی اُس پر واری جاتی ہے۔ اور بڑی بھابی بھی اُس سے راضی ہے۔" ہری کرشن کے بدن میں لرزش طاری تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔

رانی بولی "تم بات میں سے بات نکالنے کے عادی ہو۔ ایک تو خود کچھ نہیں کر سکتے۔ اس پر دوسرے کے کام میں مین میخ نکالتے ہو۔"

"بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔" ہری کرشن لحاف ایک طرف پھینک کر بولا "ایک معمولی، سا اسکول ماسٹر کر بھی کیا سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ٹیوشن پڑھا سکتا ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ بس ایم۔ اے یا ایم۔ ایڈ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی کیا ہوتا ہے۔ اُس کی کیا مجال کہ ایک تیسرے درجے کے کلرک کا مقابلہ کر سکے جس کی جیب میں سے نوٹوں کے بنڈل نکلتے رہتے ہوں۔ لوگ جس کے پیچھے پیچھے غلاموں کی طرح چلتے رہتے ہوں۔ جو یار دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھ کر روزانہ دس پانچ روپے کی چائے اور کباب کھانے کا عادی ہو۔ وہ جو ہر شام گھر میں کلو بھر گوشت لے آتا ہو۔ سب جس کی عزت کرتے ہوں۔ ہری کرشن کی تقریر بغیر رُکاوٹ کے جاری تھی۔ رانی نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے رکھی تھیں۔ وہ زور زور سے چلا رہی تھی۔

"اب بس بھی کریں۔ یہی باتیں اگر بھائی صاحب کے کانوں تک گئیں۔ ضرور جھگڑا ہوگا۔"

"سن لے۔ جو بھی سُن لے گا۔" ہری کرشن زور زور سے بول رہا تھا۔ لیکن اتنی زور سے بھی نہیں کہ اس کی آواز کمرے سے باہر جاتی۔ اس بات کا اُسے پورا خیال تھا۔ پھر بھی وہ بول رہا تھا۔

"میں نہ تو کسی کا پابند ہوں نہ نوکر۔ اپنے گذارے کے لیے بہت کماتا ہوں۔"

لیکن یہی بات رانی ہضم نہیں کر سکی، اُسے تاؤ آ گیا اور بولی۔

"خوب جانتی ہوں کیا گُذارا ہے تمہارا۔ خالی خولی اکڑ فوں ہے۔ یہ دیکھ لو، یہ میری حالت ہے۔ اور وہ تمہاری اپنی اوقات، بیوی کے جمپر پہنے بستر میں دُبک گئے ہو۔ ارے، تم سے

تو ایک چھتری نہیں خریدی جاتی۔ تم دس روپے خرچ نہیں کر سکتے۔ تم کیا اپنی بیٹی کو بیاہو گے اور کیا اپنے بیٹے کو ٹریننگ کے لیے بھیج دو گے۔"

رات کی اس بات سے ہری کرشن کو پسینے چھوٹنے لگے۔ اس کی بس گھگھی بندھ گئی اور شوہر کی حالت دیکھ کر رانی کی ہمت بندھ گئی اور وہ بولی۔

"سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ اور سچ سُن کر تم بس جھلاتے رہو گے۔ کبھی تم نے خیال بھی کیا ہے کہ میرے لئے ایک ساڑی ہی خرید کر لا دو۔ یہاں میری جیٹھانی نہ ہوتی تو بس تمہاری ہی طرح ننگی پھر رہی ہوتی۔ لیکن تم میں شرم کہاں۔ تمہارے لئے تو سب برابر ہے۔ کبھی سوچتی ہوں کہ جو لڑکے تمہیں بس ایک ہی کوٹ پہنتے دیکھتے ہوں گے۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے تمہارے بارے میں۔"

ہری کرشن اس بات پر سوچ میں پڑ گیا لیکن دوبارہ اپنی اصلی حالت میں آ گیا اور بولا "بولتی جاؤ۔ میں سن رہا ہوں۔"

"کیوں نہ بولوں۔ ضرور بولوں گی، میرا دل جل رہا ہے۔ سبھی کے تمہارے جیسے مرد ہوتے ہیں۔ جو صرف اپنی فکر رکھتے ہیں۔ اور بھی تو مرد ہیں دنیا میں جو خچر کی طرح گھر کا سامان ڈھوتے رہتے ہیں۔ تم ہو کہ مہینے کی بارہ روپلیاں میرے ہاتھ میں تھما کر چیر چیر کر واپس لے جاتے ہو۔ بس اسی پر اکڑتے ہوئے اور کہتے ہو کہ چھوٹے بھائی کی قمیض نہیں لوں گا۔ کوئی پوچھے کیوں؟۔۔ "ماناکی اس کی کمائی ٹھیک نہیں۔ وہ جائز و ناجائز طریقوں سے پیسہ کماتا ہے۔ لیکن کسی کے یہاں ڈاکے تو نہیں ڈالتا۔ کسی کے گھر میں سیندھ نہیں لگاتا۔ ارے پیسہ ملتا ہے تو لے لیتا ہے اُس کی کمائی اگر ناجائز ٹھہری تو تم بولو تمہاری کہاں کی جائز ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے، میری بھی ناجائز ہے۔" ہری کرشن یوں بول رہا تھا کہ جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ "بیوی۔ تم سے یہ امید نہ تھی۔ "میں اسی لائق ہوں مجھے جوتے مارو۔

رانی بولی "تم تو مجھے سیدھی سی بات بھی نہیں کہنے دیتے۔ دنیا میں کئی طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ کسی کی زندگی اس قدر اجیرن نہ ہو گی۔ جتنی تم نے میری زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے"۔

لیکن ہری کرشن اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر بھی بولا "میں نے نہیں۔ میری غریبی نے۔ "اپنے باپ کو دیکھو۔ ایک لمحے کے لیے بھی تمہاری ماں سے الگ نہیں رہ

سکتا۔ بھائی کو دیکھو۔ اپنی بیوی کو دلہن کی طرح سجا کر رکھتا ہے۔ اُسے دیکھ کر ہر شخص کی نظریں جُھک جاتی ہیں۔ کسی بڑے سیٹھ کی بیوی لگتی ہے۔ اور مجھے دیکھو۔ میری سی بپتا کسی پر نہ آئی ہوگی۔ میری چھوڑو۔ کم سے کم اپنے آپ کو دیکھو۔"

"مجھے کیا ہوا ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔" لیکن رانی کہاں رُکنے والی تھی۔ وہ بولی، "جو بھی تمہیں دیکھتا ہوگا، ضرور سوچتا ہوگا کہ یہ شخص یا تو لائن مین ہے یا کسی تیل کے کارخانے کا منشی یا چپراسی۔ کوئی تمہارے ماتھے کو دیکھ کر یہ نہیں دیکھتا ہوگا۔ نہ تم کتنے دھرماتما ہو۔ کس قدر دانا ہو۔ ایم۔ اے ہو۔ بہت پڑھے لکھے ہو اور ایماندار ہو۔

"لائین مین اور چپراسی انسان نہیں ہوتے ہیں کیا؟" ہری کرشن اب کج بحثی پر اُتر آیا تھا۔ وہ رانی کی باتوں کا ایک حد تک قایل ہوتا جارہا تھا۔ لیکن پھر بھی کہہ رہا تھا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ لائن مین یا چپراسی اور لوگوں سے کم درجے کے لوگ ہیں۔ وہ لوگ انسان نہیں ہوتے؟" ان کی عزت نہیں ہوتی؟"

"عزت۔ عزت اپنے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔" رانی بولی "آج کے زمانے میں عزت کپڑوں سے خریدی جاتی ہے۔ مانا کہ تمہارا بھائی تین بار میٹرک میں فیل ہوا۔ مشکل سے چوتھی بار پاس ہوا اور تم میٹرک میں اوّل آئے تھے۔ لیکن اس کا ظاہری ٹیپ ٹاپ، اس کی سج دھج دیکھ کر لوگ کیا کہتے ہیں۔ لگتا ہے ہزاروں کا تنخواہ دار ہے۔ ہر شخص اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے اور اگر تم شام کے وقت گنپت کی سڑک پر سے گذرنے لگو تو مجھے ڈر ہے کُتے تمہارے پیچھے دوڑ جائیں گے۔ یہ ہے تمہاری حالت۔"

"گویا اتنی نفرت کرتی ہو تم مجھ سے؟" ہری کرشن کو زندگی میں شاید پہلی بار اپنی کم مائیگی کا احساس ہو رہا تھا۔

"ہاں نفرت کرتی ہوں۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ کوئی تمہیں یہ جمپر پہنے دیکھے تو سہی" رانی یوں منھ بنا کر بول رہی تھی کہ جیسے وہ اپنے اندر کی ساری نفرت آنکھوں سے بہا رہی تھی۔

"جمپر پہنے دیکھا بھی تو کیا ہوا۔ کوئی کیا کرے گا۔ میرا قتل کردے گا کیا؟ تم سمجھتی ہو کہ دُنیا میں غریب اور ایماندار آدمی کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔"

ہری کرشن کی زبان پر یہ سوال تو ہر وقت رہا کرتا تھا لیکن آج پہلی بار اسے یہ سوال

فضول دکھائی دے رہا تھا۔ کیونکہ یہ بات اس کی ناداری پر پردہ نہیں ڈال سکتی تھی۔

''حق وغیرہ میں نہیں جانتی'' رانی خم ٹھونک کر بولی ''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اپنے ساتھ ساتھ تم نے میری عزت بھی خاک میں ملادی ہے۔ تمہیں تو بس بغیر اُجرت کا ایک مزدور چاہیئے تھا گھر میں کام کرنے کی خاطر۔ اور اس کا ذریعہ تم نے اُس سبزی فروش گروجی کو بنا لیا جس نے میری کنڈلی تمہاری کنڈلی سے جوڑلی اور مجھے اِس نرک میں دھکیل دیا''۔

ہری کرشن کی ہنسی چھوٹ گئی۔ لیکن سردی کی بنا پر وہ پوری طرح ہنس بھی نہ پایا۔ یہ اصل میں اُس کی ہنسی بھی نہ تھی۔ بلکہ دکھ تھا۔ اُس کا رونا تھا۔ جو اُس کی آنکھوں میں اُمڈ آنے لگا تھا۔ لیکن رورو کر وہ اپنی بیوی کی ہمدردیاں حاصل کرنے پر قائل بھی نہ تھا۔

البتہ رانی کو احساس ہونے لگا تھا کہ اُس نے زیادتی کی۔ جلی کٹی سنا کر ہری کرشن کو دکھ دیا ہے۔ لیکن دل گواہی دے رہا تھا کہ جو کچھ وہ بول رہی ہے بالکل سچ ہے۔ ہاں یہ باتیں کُھل کر کہنے کا اس وقت موقعہ نہ تھا۔ ہری کرشن بھوکے پیٹ تھا۔ بارش میں بھیگتا ہوا آرہا تھا۔ اس لیے یہ سب ٹھیک نہیں ہوا۔ یہی سوچ کر اس نے ہری کرشن کی بے مطلب مسکراہٹ دیکھ لی اور کہا۔''

''اب چھوڑیئے۔ اب آپ کی زبان لڑکھڑانے لگی ہے۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔''

''کھانا؟۔'' کھانے کا نام سُنتے ہی ہری کرشن کو اپنی بھوک یاد آ گئی۔

''اب تک کیا کچھ نہیں کھلایا تم نے۔'' وہ تو جھلاہٹ میں کچھ بھی نہ کھاتا لیکن باہر آنگن میں کتیا کے پلّے زور زور سے بلک رہے تھے۔ وہ بولا۔

''بھات یہیں لے آئی ہوں؟''

''ہاں۔ وہ رکھا ہے ٹوکری کے اندر چادر میں لپیٹ کر۔''

''تھوڑا سا اُٹھا کر تھالی میں لے جاؤ اور آنگن میں ان پلّوں کے آگے ڈال آؤ۔''

رانی اس پر بگڑ گئی اور بولی۔

''تم اپنا کھالو۔ اس کے بعد ان کے لیے بھی رکھ دیں گے۔ صرف آپ ہی کی وجہ سے یہ پلّے اس گھر میں در آئے ہیں جانے کا نام بھی نہیں لیتے۔ دن بھر تنگ کر رکھا ہے اور اب شام ہی سے پڑے پڑے بلک رہے ہیں۔''

ان کی ماں کہاں ہے۔ میں نے اُسے دیکھا بھی نہیں۔ روز کی طرح آج میرے پاس دُم ہلاتی آئی ہی نہیں؟''

"کہاں آئے گی اب۔ اس کو تو مار دیا گیا۔

مار دیا؟ کس نے؟ ہری کرشن گھبرا گیا۔ آج دن میں اسے زہر کھلا کر مار دیا گیا۔ خاکروبوں کا کیا جمعدار کہہ رہا تھا کہ گلی کے آوارہ کتوں نے شہریوں کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے۔ ان کے زندہ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

رانی کی اس بات پر ہری کرشن کے بدن میں اچانک رعشہ پیدا ہو گیا۔ وہ ٹھٹھرنے لگا۔ اُس کے دانت زور زور سے بجنے لگے۔ رانی گھبرا گئی۔

"کیا ہوا؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" ہری کرشن کا بدن لرز رہا تھا۔

وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ لیکن دانت ایسے بج رہے تھے کہ منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

رانی کچھ بھی نہ سمجھ سکی کیا ہو رہا ہے۔ اُس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی ساس کو پکارنا شروع کیا۔

"ماتا جی۔ ماتا جی۔ آپ آ جائیں۔ جانے ان کو کیا ہوا ہے؟" وہ رونے لگی ہری کرشن کی ماں نے بہو کی پکار سن لی۔ وہ بستر سے نکل آئی۔ لیکن خاوند نے کپڑے نہ چھوڑے۔

"مجھے جانے دو۔" اس کی آواز میں غُراہٹ تھی۔ اتنی اونچی کہ سبھی کمروں تک گئی ہو گی۔

"تو جاؤ۔ ایسے ہی پیٹی کوٹ پہن کر۔ میں ساڑی نہیں چھوڑوں گا۔"

"کیا تماشا کر رہے ہو؟" ماتا جی بولیں "سچ کہا ہے کہ سٹھیا گیا آدمی یا تو میٹھا کہلاتا ہے یا بے وقوف۔" "تم تو سٹھیا کر دیوانے لگتے ہو۔"

"ہاں۔ میں دیوانہ ہوں۔" پنڈت مسکرا کر بولا "تیرا دیوانہ۔ تو بھی میٹھی نہیں لگ رہی۔"

"یہ کیا کر رہے ہو۔ دن میں یہاں ہوتے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ماتا کیا ہوتی ہے۔ بے چاری کُتیا ہلکان ہو رہی تھی۔"

"کیوں کیا زہر کھانے کی بناء پر؟"

"ہاں۔ خود مر رہی تھی بے چاری۔ جب بھی اپنے آپ کو بچوں تک گھسیٹ کر لے گئی ان پر نثار ہوئی جا رہی تھی۔"

"ڈرتا ہوں کہ تم مجھے بھی کسی روز زہر کھانے پر مجبور کر دو گی۔"

"اب میں جا کر دیدی کو بُلاتی ہوں۔ وہی تم سے خوب نمٹنا جانتی ہے۔"

ماتاجی نے جھپٹ کر اپنی ساڑھی اٹھالی اور دروازے میں کھڑے ،ہو کر لپیٹنے لگی۔ایسے میں رانی کی دستک سنائی دی۔

"ماتاجی۔ آپ آجائیں۔انہیں نہ جانے کیا ہوا ہے۔" رانی کی آواز سُن کر ناتھ جی بھی نیند سے جاگ پڑا تھا وہ دوڑ تا ہوا آیا اور کوئی لحاظ کئے بغیر زور کا تھپڑ رانی کے منہ پر مار دیا۔

"تم میاں بیوی نے گھر میں سب کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔" رانی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گلی میں پڑے پڑے وہ باضابطہ بین کرنے لگی۔ جسے سُن کر ہری کرشن بھی بستر چھوڑ تا ہوا آگیا۔

وہ اپنی بیوی کو گھسیٹ کر اپنے کمرے میں لے گیا اور دروازہ زور سے پٹخ کر اندر سے کُنڈی لگادی۔

تاج بیگم رینزو

بوبا صاحبہ کی صوبہ داری

"اے۔اسے یہاں نہیں۔ ہر گز نہیں۔ بس دور کر اسے میری نظروں سے۔اور کوئی دیکھے تو سہی یہ کیا سوغات لئے منہ اُٹھائے چلا آرہا ہے؟ چوزے جتنا بھیڑ کا بچہ !بس۔ بس۔ دور کر اسے۔" بوبا صاحبہ نے کریم کو ایسی ڈانٹ پلائی کہ گھر کے سبھی افراد سبھی نوکر چاکر کونوں میں چُھپنے لگے، جس طرح شیرنی کی گرج سُنتے ہی گیدڑ سہم کر چُھپ جاتے ہیں۔ مال دید غسل خانے میں چلی گئی۔ ولی چولہے میں سردئے لکڑیوں میں آگ بھڑکانے کی کوششوں میں لگ گیا۔ احمد نے شیشے صاف کرنا شروع کر دئے اور صابر بوبا صاحبہ کے لیے حقہ تیار کرنے میں جُٹ گیا۔ بیگم صاحبہ خود بھی انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ ان کے کان سُرخ ہو گئے تھے اور ان کے چہیتے نوکر یعنی کریم کے آگے کوئی شخص سر جھکائے کھڑا تھا اور سہم رہا تھا۔

"نہیں بوبا صاحبہ۔ یہ بے چارہ پھر بھی اپنا ہی آدمی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چھ مہینے تک اپنے ہی کسی کام میں مصروف رہا ہو گا۔" کریم نے وکالت کرنا چاہی۔

"ہاں۔ہاں۔بے چارہ۔ برے چارہ۔ان جیسے لوگوں کو جس گھر میں جانا ہوتا ہے وہاں جا کر ہی دکھاتے ہیں یہ لوگ۔اور آج یہ احسان جتلانے آیا ہے، بھیڑ کا بچہ اٹھائے۔لے جاؤ اس کا مینہ میری نظروں سے دور کر دو۔" بیگم صاحبہ نے اپنے مخصوص اشارے کے ہاتھ کریم کی اُور لہرائے۔

"کوئی نہیں جناب۔ بوبا صاحبہ ہماری ماں ہیں۔ ہم ان کے خاکِ پا کے برابر بھی نہیں۔" وہ شخص ڈرتے ڈرتے بولا۔

"ارے ماں نہیں۔ میں دادی لگتی ہوں تیری۔ مُشٹنڈے !دفع ہو جا، گنوار کہیں کے۔ یہ شخص بے وقوف ہے جیسے تم چکمہ دے کر اندر آگئے ہو۔ جانتی ہوں کہ تیرے جیسے گنوار وشیطان کو بھی مات دیتے ہیں۔" بوبا صاحبہ آگ اُگل رہی تھیں۔

''آپ کا اختیار ہے بوبا صاحبہ۔ آپ چاہیں تو مار بھی سکتی ہیں۔ آقا کا اپنے غلام پر کلی اختیار ہے۔''

''دیکھ تو لو اس کا سوانگ۔ دیکھو کیا بک رہا ہے۔ مجھے لالچ دے رہا ہے۔
میمنہ لے کر آیا ہے، میمنہ۔ دفع کر اس چوزے کو۔ لے جاؤ اسے۔ میرا حکم ہے!!''

''بوبا صاحبہ اُٹھنے ہی لگی تھیں کہ صابر حقہ اٹھائے دوڑتا ہوا آگیا۔ چلم میں پھونکیں مارتے ہوئے اُس نے حُقے کی نلی بیگم صاحبہ کی اُور بڑھادی اور کہا۔

''جانے بھی دیں بوبا صاحبہ۔ آپ چلا چلا کر اپنا گلا خراب کر رہی ہیں۔ دیکھیں تو سہی سانس کس قدر پھول رہا ہے آپ کا۔ اور وہ بھی اس گنوار کی خاطر۔ آپ خود ہی کہہ رہی تھیں گنوار شیطان کو بھی مات دے گیا ہے۔ اب چھوڑ بھی دیں۔ آپ حقہ پی لیں۔ ہاں شاباش زور کا کش لگائیں۔ اور زور کا۔۔۔''

''بوبا صاحبہ۔ آپ اسے میری ضمانت پر جانے دیں۔'' کریم مسکرا کر بولا۔

''اے۔ تو بک بک نہ کر۔ تو نے ہی ان جیسے لوگوں کو سر چڑھایا ہے۔ تیری قسم میں اس کا یہ میمنہ لینے والی نہیں۔ اسے مجھ سے دور کر دے۔'' بوبا صاحبہ اپنی جگہ اٹل تھیں اور بے چارہ دیہاتی من ہی من حسبناء اللہ کا وِرد کر رہا تھا۔

کریم نے دیہاتی کے ہاتھ پر جھپٹا مارا اور اسے یوں گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا جیسے بے چارہ میمنہ قصائی کی بیوی کے چُھری تلے سے آزاد تو ہو گیا ہو البتہ اُسے بذات خود ذبح خانے کی طرف گھسیٹ رہا ہو۔ باہر جا کر کریم اُسے سمجھانے لگا۔

''یہ بتاؤ۔ تیری عقل کہاں گئی ہے۔ یہ تجھے ہو کیا گیا ہے۔ ایک تو پورے چھ مہینے بعد حاضر ہوئے اور اس پر بھی نہ تو مرغ اپنے ساتھ لے آئے ہو نہ آٹا۔ نہ میوہ ہے نہ باقر خوانیاں اب اگر آئے بھی ہو تو بقول بوبا صاحبہ چوزے جتنا میمنہ اُٹھائے۔ ارے اگر یہی لانا تھا، تو کم از کم بیس پچیس کلو موٹھ بھی لے آتے۔ اس کے لیے گھاس ہی لے آتے۔ خیر جانے دو۔ ابھی تم چلے جاؤ۔''

بوبا صاحبہ بشیر کی بیوی تھیں اور بشیر صاحب حاکم اعلیٰ کے برادرِ نسبتی تھے۔ حاکم اعلیٰ نے ان ہی بشیر صاحب کو قوم کا اَن داتا بنایا ہوا تھا۔ نہ صرف قوم کا بلکہ حکومت کا کرتا دھرتا بھی۔ البتہ بعد از حاکم اعلیٰ تمام افسران وزراء صاحبان بشیر صاحب ہی کے آگے دوزانو ہو جاتے تھے۔ علیٰ الصباح ان کی ڈیوڑھی پر حاضر رہا کرتے تھے اور ان کی عالیشان کوٹھی کو دُزدیدہ نظروں

سے تکا کرتے تھے۔ جس کسی شخص کو اُن کے یہاں شرفِ باریابی حاصل ہو جاتا، وہ بڑی تقدیر والا کہلاتا تھا اور جس کسی کے حق میں مناہی کا حکم جاری ہوتا اُس کی دُرگت بے چارے میمنے کی سی ہو جاتی تھی کہ دُم دبا کر بھاگتے ہی بنتی تھی۔ بشیر صاحب کے یہاں شرفِ باریابی حاصل کرنا گویا سانپ بچھو یا اژدہے کے راجہ کے گلے میں ہاتھ ڈالنا تھا۔

البتہ ایک ذریعہ تھا کہ جس کی مدد سے بشیر صاحب تک رسائی ممکن تھی اور وہ تھا بوبا صاحبہ کا ذریعہ۔ اور بوبا صاحبہ تک پہنچنے کے وسائل بہت تھے۔ وہ تھے، کریم، محمود، مال دید اور ولی۔ سب سے بڑی پہنچ کریم کی تھی۔ کریم صاحب کی، پیارے کریم کی، بوبا صاحبہ کے چہیتے نوکر کی پہنچ کریم کی پہنچ اور بوبا صاحبہ کے یہاں رسائی حاصل کرنا بشیر صاحب سے ملاقات کرنا تھا۔ کاغذ پر بوبا صاحبہ کی مُہر بشیر صاحب کے یہاں عزت و تکریم کی ضامن تھی۔

کریم۔ عبدالکریم، بوبا صاحبہ کا کریم جب بھی موڈ میں ہوتا، بوبا صاحبہ کی عدالت جمتی تھی۔ آج صبح ہی سے بوبا صاحبہ کی عدالت جاری تھی۔ سُبحان ڈار سے اُس کی بیوی الگ ہو گئی تھی۔ اُس نے عدالت میں تنسیخ نکاح کا دعوا دائر کروایا تھا اور خاوند کے خلاف عدالت سے ڈگری بھی لے آئی تھی۔ اس کا خاوند سُبحان ڈار شرابی تھا۔ ڈاکے ڈالتا تھا۔ جوا کھیلتا تھا اور روزانہ بیوی کو پیٹتا رہتا تھا۔ تنگ آکر بیوی نے خاوند کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا تھا یہاں تک کہ ہائی کورٹ سے بھی اپنے حق میں فیصلہ لے کر خاوند سے خلاصی پا چکی تھی۔ لیکن ابھی بھی بوبا صاحبہ کی عدالت باقی تھی جس کی پیشی آج ہو رہی تھی۔ کورٹ فیس وغیرہ تو کریم نے پہلے ہی وصول کر لیا تھا جس میں وہ دو بھیڑ، تین مُرغ، انڈوں کا پورا کریٹ اور بیس روپے نقد سبحان ڈار سے وصول کئے جا چکے تھے۔ چنانچہ آج اسی بنا پر بوبا صاحبہ کی طرف فریقین کے نام سمن جاری کیا گیا تھا۔ وہ خود گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے پُر وقار انداز میں بیٹھی تھیں اور دونوں فریقین عدالت میں دائیں اور بائیں طرف سر جھکائے کھڑے تھے۔ بیگم صاحبہ غصے میں زور زور سے بول رہی تھیں۔

"توبہ میری توبہ۔ یہ تو بے حیائی کی حد ہے۔ بدمعاشیاں تو ہم نے بھی سنی ہیں، لیکن یہ بلا؟۔ ایک عورت ہوتے ہوئے بھی یہ عدالت جاتی ہے۔ مقدمہ دائر کرتی ہے۔ خلاصی لیتی ہے اپنے خاوند کے خلاف۔ اللہ معاف کرے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ اصل میں کنجری ہے۔ دس نمبری بدمعاش ہے۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی پتہ چلتا ہے کہ یہ کیا ہے۔" بوبا صاحبہ گالیاں دے رہی

تھیں اور وہ بے چاری عورت پاس پڑی خون کے آنسو رو رہی تھی۔ اتنے آنسو کہ جہنم کی آگ بجھائی جا سکتی تھی۔ اپنے آنچل سے آنسو پونچھ پونچھ کر وہ سُرخ آنکھوں سے بوبا صاحبہ کو یوں گھور رہی تھی کہ جیسے ناگن کی آنکھوں میں گھور رہی ہو۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"بوبا صاحبہ۔ آپ خود سوچیں۔ بھلا میں اور کر ہی کیا سکتی تھی۔ پورے دس سال یہ شخص گھر سے باہر رہا۔ اتنی دیر تک اپنی لاج بچاتی رہی۔ یہ چوریاں کرتا تھا۔ شراب پیتا تھا۔ مجھے رسی سے باندھ کر رکھتا تھا۔ مارتا تھا مجھے، میں بھوکے دن پیٹ کاٹتی رہی۔ اور بھلا کیا کر سکتی تھی۔ کیا میں بازار میں اپنا جسم بیچتی پھرتی اور جبھی آپ لوگوں کو چین ملتا؟"

"اے چُپ بے حیا۔ بد معاش عورت۔ تجھے تو شرم آنی چاہیئے۔ مرد آخر مرد ہے گھر سے باہر کچھ بھی کرنے کا حق ہے اُسے۔ بھلا عورت کا اُس کے معاملوں میں کیا دخل۔ نہ تو تجھے اسلام کی خبر ہے اور نہ شریعت کی۔"

"جی ہاں۔ اسلام کا فرمان ہے کہ بیوی کا نان نفقہ ہر صورت میں ملنا چاہیئے۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ بیوی کو خالی پیٹ رہنے پر مجبور کرو۔ کمرے میں گائے کی طرح باندھ کر رکھ دو۔ عورت کی ضرورت اگر ہے تو کیا اس کا فرض نہیں کہ اُس کے کھانے پینے اور پہننے کا بندوبست بھی کیا جائے۔" بوبا صاحبہ عورت کا یہ جواب سُن کر سٹپٹا گئیں۔ کچھ بھی نہ بول سکیں۔ البتہ عورت کے والد نے کہنا شروع کیا۔

"ایک بات اور بوبا صاحبہ۔ اس معاملے میں ساری عدالتیں یہاں تک کہ ہائی کورٹ بھی اپنا فیصلہ دے چکی ہے۔ از روے قانون اور شریعت میری بیٹی اب اس کی بیوی نہیں رہی ہے اور نہ ہی یہ شخص میری بیٹی کا خاوند ہے۔ بات ختم ہو چکی ہے۔ اب گڑے مُردے اُکھاڑنے سے کیا حاصل۔" عورت نے جہاں بوبا صاحبہ کی سٹی گم کر دی تھی۔ وہاں اُس کے باپ کی باتوں نے بوبا صاحبہ کی غیرت کو للکار دیا تھا۔ وہ بپھر گئی۔

"چُپ او بھڑوے۔ بیٹی سے پیشہ کروانا ہے کیا؟ تیری ہی جیسے سادھو نما شیطانوں کی وجہ سے دُنیا کی حالت خراب ہے۔ او۔ کریم۔ کرما۔ دیکھ کیا کہہ رہا ہے۔ اُٹھ کر اس کی عقل ٹھکانے لگا دے۔"

کریم اُٹھا اور اُس کے ایک تھپڑ سے بوڑھا دراز ہو گیا۔ گھونسوں اور لاتوں کی وجہ سے اُس کی ناک سے خون جاری ہونے لگا تھا۔ ذبح کئے جا رہے بھیڑ کی مانند۔ بوبا صاحب غصے

میں بول رہی تھیں۔

"ہاں مار دو اسے۔ ایک اور مار واس کنجر کو۔ بھڑوے کو، جب تک کہ یہ سُسرا پوری طرح جان نہ جائے کی اصلی عدالت کیا ہوتی ہے۔ بک بک کا نتیجہ کیا ہوتا۔"

سبحان ڈار کی مطلقہ منہ پیٹ رہی تھی۔ زور زور سے چلا رہی تھی کہ میرے اللہ۔ یہاں کوئی نہیں ہے کیا؟ بوبا صاحبہ۔ میں آپ کے صدقے۔ میرے باپ کو چھوڑ دیں۔ حضرت وہی کروں گی جو آپ کہیں۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ باپ فرش پر لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔ نُچا ہوا پرندہ، باز کے پنجوں میں بند۔

"اے کھڑے ہو جا بڈھے۔ سوانگ نہ دیکھا۔" کریم کے ساتھ ساتھ اور نوکر بھی اُسے گھسیٹ کر لے گیا اور سرکاری نل کے نیچے ڈال آئے۔ بڈھا تھوڑی دیر بعد ہی اپنا منہ ٹھنڈے پانی سے دھو کر واپس آگیا تھا۔ بوبا صاحبہ اتنی دیر منہ میں مرچیں رکھے ان کی کڑواہٹ دور دور تک اُگل رہی تھیں۔ حقے سے دھویں کے بڑے بڑے مرغولے لگاتار اُٹھ رہے تھے۔ چنانچہ بڈھے کے واپس آتے ہی وہ بولیں۔

"آ گئی عقل ٹھکانے، کنجر کہیں کے۔ بھڑوے۔ کیا اب بھی اپنی بیٹی کو سُسرال بھیجنے پر راضی نہیں ہو؟"

"کون سی سُسرال؟۔ یہاں کوئی قانون نہیں ہے کیا؟"

"اے۔ تو وہی ڈھاک کے تین پات۔" کریم بولا "بھلا ہائی کورٹ کا حکم ہماری بوبا صاحبہ کے حکم سے بھی بڑا ہے کیا۔ سب سے بڑی عدالت تو بوبا صاحبہ کی ہے۔ کیا تجھے اپنی جان پیاری نہیں جو ایک ہی بات کی رٹ لگائے جا رہے ہو۔ خاموش رہ اور دھیان سے سُن۔ بزرگوں کی بات بلا چون، چرا اں کے مان لینی چاہئیں۔ اسی میں تیری بہتری ہے۔"

کریم کو اتنا ہی کہنا تھا کہ بوبا صاحبہ پھر ایک بار برس پڑیں۔

"ابے او سبحانا۔ خُسرے۔ سالے۔ کیا دیکھ رہا ہے۔ اُٹھ اور اس کنجری کو گھسیٹ کر اپنے گھر لے جا۔ وہیں اسے پوری طرح سمجھا دے کہ ہائی کورٹ کسے کہتے ہیں۔ یہ میرا حکم ہے۔"

سُبحان ایک دیو کی طرح سینہ تان کر کھڑا ہو گیا شکل سے ہی بدمعاش اور خوفناک تھا۔ ایک جست میں اس نے بیوی کو پکڑ کر اپنے بازوؤں میں گھڑی کی طرح اُچھال دیا۔ بوڑھا لپک کر اُس کے پیچھے دوڑنے لگا کہ نوکروں نے اُسے گھونسے مار مار کر واپس اندر دھکیل دیا۔ ایک بار پھر

وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ دروازے کے باہر تانگہ تیار کھڑا تھا۔ اور جب چیل چوزے کو اُڑا لے گئی تھی۔ بڈھے کو بھی لاش کی طرح سڑک پر پھینک دیا گیا۔ وہ رو رو کر اپنی لڑکھڑائی زبان میں صرف ایک ہی بات کی رٹ لگائے ہوا تھا۔

''نوری۔۔۔ کہاں گئی۔''

بوبا صاحبہ ایک صبح تڑکے ہی کندہ کاری سماوار میں بشیر صاحب کے لیے قہوہ لے کر گئی تھیں۔ بشیر صاحب پشمینے کے پھیرن پہنے، سر پر کنٹوپ رکھے، گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ بوبا صاحبہ پیالی میں تھوڑا تھوڑا قہوہ انڈیلتی جا رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔

''اب تو صابر بٹ کی آنکھ کا پانی مر گیا ہے۔ اس نے اس بات کا خیال تک نہ کیا کہ بھلا جب اس قدر امیر کبیر ہمسائے نے اپنی کوٹھی کا گیٹ اینٹوں سے بنوایا ہے، میں کس حیثیت سے پتھروں کا گیٹ کھڑا کرنے کی جسارت کروں؟ اصل میں اس کے یہاں چوری چکاری سے بہت مال دولت آ گئی ہے۔ جو اب تک چھپا کے رکھی گئی تھی۔ اس کی تو آنکھوں میں۔۔۔۔ لیکن میں آپ کو بھی سمجھ نہیں سکی ہوں اب تک۔''

''ہوں'' بشیر صاحب جیسے سب سُن رہے تھے، بولے ''ہاں۔ سُن رہا ہوں'' لیکن بوبا صاحبہ بگڑ کر بولیں۔

''یہ ہوں کا کیا مطلب ہے۔ ایک بار کہے دیتی ہوں۔ ان کے پر ابھی سے تراش کر رکھ دو۔ بعد میں بے لگام ہو جائیں گے۔ ایک وہ ہے، رحمان کانٹر۔ ہمارے لان جہاں کہیں بھی نئی قسم کا پھول دیکھتا ہے، جھٹ سے اپنے یہاں بھی کیاریوں میں لگوا دیتا ہے۔ ہم نے لان میں گھاس لگوا دی، دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے بھی لگوا دی۔ ہم نے مکان میں پینٹ لگوایا اور اس نے بھی اپنے یہاں رنگ سازوں کی فوج اکٹھی کر لی۔ ان لوگوں کی تو آنکھیں نہیں پھوٹ جاتیں۔ ہر بات میں ہی ہماری ہی برابری پر اُتر آئے ہیں۔

''ہوں'' بشیر صاحب یوں بول رہے تھے کہ جیسے سب کچھ سمجھ رہے تھے۔ وہ بولیں۔

''آپ کی سمجھ میں یہ باتیں کہاں سے آئیں گی۔ دیکھیں تو سہی ان کی جُرات گرونام داس کے باغ میں سے ہم نے سال تیں بودے کی دو شاخیں اُتروالی تھیں اور ان کو اپنے یہاں باغ میں لگوا دیا تھا۔ بس اسی بات پر اُس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ اور اب یاد ہی نہیں کہ کیا کیا کہہ گیا تھا سُسرا۔''

''ہوں۔ سمجھ گیا، سُن رہا ہوں۔''

"یہ بھی سُن لو کہ شرما کی زمین میں سے ہم نے سینچائی کے لیے چھوٹی سی نہر کھود ڈالی تھی۔ اُس نے کہلوا بھیجا ہے کہ میری زمین کسی کے باپ کی میراث نہیں۔ نہر اگر بنوانی ہے تو سرکاری زمین پر بنوادو۔ اور آپ ہیں کہ شرما صاحب کے نام کی رٹ لگاتے پھرتے ہیں۔ آپ نہیں جانتے اس کا کمینہ پن اور دیکھو، اس کی زمین میں کتنی اچھی سبزی لگی ہے، کبھی اسے توفیق نہ ہوئی کہ ہمارے یہاں ٹوکری بھر سبزی بھجوادے۔"

"دیکھ لوگے۔ صرف کہوگے، کروگے کچھ بھی نہیں۔ آپ نہیں جانتے کتنے خود غرض ہمسائے ہیں ہمارے۔ کہاں وہ اگلے وقتوں کے ہمسائے۔ یہ تو وہ ہیں ہی نہیں جو ہمارے یہاں آکر مختلف کاموں میں ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ ایک ڈیڑھ خروار چاول صاف کرتے تھے۔ وہ لوگ گاؤخانے کا گوبر بھی خوشی خوشی اٹھا کر باہر لے جاتے تھے۔"

"ہوں۔۔۔۔۔۔"

"کیا آدمی ہے یہ؟ ہوں۔ فقط ہوں لگی ہے۔ منحوس۔ اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور باغ میں جاؤ۔ وہاں کام ہو رہا ہے۔"

"تم خود ہی جا کر دیکھ لو۔۔۔۔"

باغ میں محکمۂ زراعت کے ادنیٰ و اعلیٰ افسر پریڈ میں لگے تھے۔ کوئی لان میں لگی گھاس کا معائنہ کر رہا تھا اور دیکھو درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ کئی ایک پھولوں کی فہرست تیار کرنے میں مصروف تھے اور کئی دوائی کی شیشیاں ہاتھوں میں لئے لئے دوڑ رہے تھے۔

"بھلا کیا افسر ہو تم لوگ بھی؟ تم سے تو یہ بھی نہیں ہو رہا ہے کہ اس باغ کو نشاط باغ سے بھی خوبصورت باغ بنادو۔"

"بوبا صاحبہ۔۔ ہم اپنے خون سے اس باغ کی سینچائی کریں گے۔ ایک افسر ڈرتے ڈرتے بول رہا تھا۔

"مجھے بالکل یقین نہیں۔"

"آپ دیکھ ہی لیں گی کہ ہم کیا نہیں کر سکتے۔" ایک اور افسر بالٹی ہاتھ میں دے کر بولا۔

"کیا کرلوگے تم؟ اپنی آنکھیں خود اپنے ہی ہاتھوں پھوڑ دوگے۔ ابھی تک تو تم نے پودوں میں انجکشن نہیں لگوائے۔"

"جناب۔ دوا کے انجکشن نہیں۔ ہم اپنے خون کے انجکشن لگوادیں گے۔"

"چھوڑو بھی۔ تم افسر لوگ زمانے بھر کے طوطا چشم ہو۔" بوبا صاحبہ مسکرا کر بولیں اور سبھی افسران ایک دوسرے کی آنکھوں میں طوطے تلاش کرنے لگے۔

"اور ہاں" بوبا صاحبہ بولیں "ہمارا سبزی والا باغ لاثانی ہونا چاہیئے۔"

"بہت بہتر جناب۔"

"فقط بہتر کی رٹ لگائے جا رہے ہو۔ کچھ کرو گے بھی۔ میں تمہیں جبھی افسر مان لوں گی جب تم صرف دس روز کے اندر اس باغ میں سبزی اگا کر دکھاؤ گے۔"

"جناب ہم نے اس قدر اعلیٰ قسم کے بیج لگادئے ہیں کہ دس گھنٹوں کے اندر ہی تیار ہو سکتے ہیں۔"

بوبا صاحبہ کے باغ میں پودوں کی سینچائی فائر برگیڈ والوں کی پائپ سے ہوری تھی فائیر انجن کی مدد سے سبزے پر پانی دیا جا رہا تھا۔ بوبا صاحبہ کے ہمسائے رحیم صاحب اپنے ہی مکان کے لان میں بیٹھے کئی ایک مہمانوں کی تواضع میں لگے تھے۔ وہ مہمانوں کے بیچ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ایسے میں معلوم نہیں کیا ہوا کہ فائیر مین کی پائپ کا رُخ رحیم صاحب کے مکان کی اُور ہو گیا۔ یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایسا بوبا صاحبہ کے اشارے پر ہوا تھا یا فائیر مین کی کوئی غلطی تھی۔ بہر حال دیوار سے پانی اُچھل اُچھل کر رحیم صاحب اور ان کے مہمانوں پر آگرا۔ سبھی کے کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ لیکن بے چارے کچھ نہ کر سکے۔ کیونکہ مظلوم تو ہر حالت میں مظلوم ہی رہتا ہے۔

رحیم صاحب نے بے چارگی سے بوبا صاحبہ کی طرف نظریں اٹھادیں اور بیگم صاحبہ اسے واپس گھورنے لگیں۔ رحیم صاحب کی دُرگت دیکھتے ہوئے ان کے چہرے پر روشنی آگئی۔ البتہ دنیاداری کی خاطر ہاتھ اُٹھا کر فائیر مین سے بولیں۔

"اب رہنے بھی دو۔ یہ پائپ ہٹادو۔ ہمارے ہمسائے جناب خواجہ صاحب کو ہماری خوشی راس نہیں آتی۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ یہاں ہمارا وجود ہی نہ ہوتا۔ خدا جانے ہم نے دُنیا بھر کے لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔"

دیپک کول

رادھے کاک کی بلّی

واسہ کاک یہاں بلّی کیا آگئی کہ سب سے پہلے اُسے ساس کی طرف سے پٹّی پڑھائی گئی کہ اُس پار والی پوشہ کُج سے کسی بھی طرح کی بات چیت نہیں کرنا ہے۔ اُس کی عادت ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ دوسرا عیب اُس میں یہ بھی ہے کہ اُس کی آنکھ خراب ہے سمجھو ایک ڈائن ہے جو دن بھر کھڑکی کے اندر دھنی اوروں پر نظر رکھتی ہے۔ بہو کو تو اس بات کا بالکل یقین نہ آیا۔ وہ سمجھی کہ اس کی ساس خاندانی چپقلش کی بنا پر ایسا بول رہی ہے۔

ورنہ حقیقت بھی یہی تھی کہ محلّے کی سبھی عورتیں پوشہ کُج سے ڈرتی تھیں۔ لوگ کہتے تھے جن اور بھوت تو کچھ نہ کچھ کھلا پلا کے بھگائے جاسکتے ہیں لیکن پوشہ کُج کا کچھ بھی نہیں بگاڑا جاسکتا۔ وہ جب بھی کھڑکی کے اندر براجمان ہوتی گھر والیاں نہ تو اپنے بچوں کو اسکول جانے دیتی تھیں اور نہ ہی شوہر کو دفتر۔ مجبوری کی حالت میں ایسا کرتیں کہ پوشہ کُج نزدیک جاکر اسے باتوں میں لگادیتیں، جب تک کہ بچہ یا شوہر پوشہ کُج کی آنکھ بچاکر اپنے کام کے لیے نکل جاتا تھا۔ وہ تو پچھلے پہر ہی سے کھڑکی پکڑ کر بیٹھ جاتی تھی اور تب تک وہیں دھپ سے بیٹھی رہتی تھی۔ جب تک رات کے پہریدار گشت پر نہ نکل آتے تھے۔ اس کی کھڑکی کا بڑا وصف تھا کہ وہاں سے لوگوں کی ہر حرکت پر نظر رکھی جاسکتی تھی۔ کون کہاں گیا، کون کس کے یہاں چلا آیا، کون کیا لے کر گیا، کس نے کیا کھایا پیا، ان سب باتوں کی خبر اُسے کھڑکی پر بیٹھے بیٹھے ہی مل جاتی تھی۔ پتہ نہ چلنے کی صورت میں وہ بے کل سی رہتی تھی اور تب تک ہرگز چین نہ لے پاتی تھی جب تک کسی بوڑھے، بچے، عورت یا مرد کی خاطر مدارات کر کے اصل بات کرید کر نہ رکھ دیتی تھی۔ اس کا تجسس اس قدر شدید تھا کہ اُس کی راتوں کی نیند حرام کر دیتا تھا۔ اور اُسے بات کی کھوج لگانے کا فن بھی خوب آتا تھا۔ حالانکہ سبھی محلّے والیاں اس بات سے پوری طرح واقف

تھیں کہ پوشہ ژُج سے گھل مل جانے کا مطلب چوراہے پر اپنا بھانڈا پھوڑنے کے برابر ہے، پھر بھی وہ اصل بات اُگل ہی دیتی تھیں۔ حالانکہ ہر بات پر وہ پوشہ ژُج سے اس بات کی تاکید کرتی تھیں کہ اس بات کا پتہ کسی کو بھی چلنے نہ پائے۔ وہ لوگ میرے بال کاٹ کر رکھ دیں گے۔ جواب میں پوشہ ژُج بڑے وثوق سے کہہ دیتی۔ اری۔ باولی ہوگئی ہے؟ تو تو جانتی ہے کہ میری اس طرح کی عادت نہیں۔" لیکن ایک بار جب پوشہ ژُج کے کان میں کسی بات کی بھنک پڑ جاتی۔ اس کے لیے چُپ بیٹھنا محال ہو جاتا تھا۔ اس صورت میں دو بھانڈوں کا آپس میں ٹکرا کر پھوٹ جانا یقینی بن جاتا تھا۔ پنگھٹ، نل، بازار، گھاٹ۔ غرض جہاں بھی پوشہ ژُج کو موقعہ مل جاتا تھا، وہ اپنا کام کر جاتی تھی۔ مندر کو جاتے یا مندر سے آتے ہوئے جب وہ لوگ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے دیکھتی تھی، عجیب سا سرور اُس کے ذہن پر چھا جاتا تھا۔ وہ ان جھگڑوں میں خوب مزہ لیتی تھی۔ اور بعد میں بڑی بی بن کے وہ لڑنے والیوں کے بیچ آدھمکتی تھی اور انہیں ایک دوسرے سے الگ کر لیتی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اتنی دیر میں دونوں لڑنے والیوں نے ایک دوسرے کی برائیاں گناتے ہوئے محلے سے اپنی ہی مٹی پلید کر کے رکھ دی ہوتی تھی۔

بات یہ نہ تھی کہ محلے والیاں پوشہ ژُج کی فطرت سے واقف نہ تھیں۔ وہ تو اس کی رگ رگ کو جانتی تھیں، پھر بھی نہ جانے کیوں ہر عورت اس سے دبتی ہی نظر آتی تھی۔ جانے کون سا خوف تھا ان پر کہ پوشہ ژُج کے آگے اونچی آواز میں بات کرنے سے ڈرتی تھیں۔

پوشہ ژُج نے اپنے شوہر کو بھی دبا کر رکھا ہوا تھا۔ اُس کو اپنے قریب ہرگز پھٹکنے نہیں دیتی تھی۔ بے چارہ شریف آدمی! لڑائی جھگڑے سے دور ہی بھاگتا تھا۔ صُبح اُٹھ کر پوجا کرتا تھا۔ دیوی سے منتیں مانگتا تھا، اپنی پگڑی سر پر سجا کر وہ حُقے کے دو چار کش لیتا تھا، پھر کھانا کھاتا تھا اور دفتر کو جاتا تھا۔ شام کو دیر گئے گھر لوٹتا تھا۔ پوشہ ژُج کے ہاتھوں چائے ملتی تو پی لیتا تھا اور کسی سادھو سنت کے ہاں نکل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اور کسی سے اس کی جان پہچان نہ تھی۔ وہ تو بس دھر ماتما تھا اور بھگوان نے اولاد جیسی نعمت سے دور ہی رکھا تھا۔ محلے میں کوئی بھی شخص اُسے اپنے نام سے جانتا بھی نہ تھا۔ بلکہ پوشہ ژُج ہی وساطت سے سبھی میں اُس کی پہچان تھی۔ وہ اسے 'پوشہ ژُج' کا رادھے کاک کہتے تھے۔ اور رادھے کاک کی پوشہ ژُج جیسی کوئی تھی ہی نہیں۔

گھر گرہستی کا جہاں تک تعلق ہے، ہر چیز پر پوشہ ژُج ہی کی عمل داری تھی۔ لکڑی والے سے لکڑی خریدنا ہوتی تو پوشہ ژُج اپنی نگرانی میں وزن کرواتی۔ تیل والا

تیل دینے آتا تو پوشہ کُج ہی دیکھتی کہ کہیں مول تول میں بے ایمانی تو نہیں ہو رہی۔ وہ جس سے چاہتی کھڑکی میں بیٹھے بیٹھے ہی سودا طے کر لیتی تھی۔ جہاں کہیں سے بھی کوئی سبزی والی، مچھلی والی، سنگھاڑے یا کھیرے بیچنے والی اُس کھڑکی کے نیچے والی گلی سے گذرتی پوشہ کُج اُسے پکار کر روک لیتی تھی۔ اور دکھاوے کی خاطر اونچی آواز میں اُس سے مول تول کرتی رہتی۔ بعد میں تھوڑے سے چاول دے کر اس سے ڈھیر سارا مال چھین لیتی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اور لوگوں کے لیے پریشانیاں پیدا کرتی تھی کیونکہ ایک بار پوشہ کُج کے چنگل میں پھنس جانے کے بعد کوئی بھی چھابڑی والا اُس گلی کا رُخ نہیں کرتا تھا، وہاں سے گذرنے کا نام بھی نہ لیتا تھا۔ پوشہ ہر سودے میں سونے کے بھاؤ کا مول تول کرنے کی عادی تھی۔ یعنی دُمڑی کا سودا اور بازار میں کھلبلی۔ پوشہ کُج کو مول تول کرتے دیکھ کر محلے والیاں اپنے اپنے گھروں سے نکل آتی تھیں اور اس کے گرد جمع ہو جاتی تھیں۔ اور پوشہ کُج کو اسی بہانے موقعہ مل جاتا تھا اور وہ کرید کرید کر ہر عورت سے پتہ لگا لیتی تھی کہ فلاں گھر کی منگنی میں کیا کیا چیز آگئی۔ فلاں گھر میں جنم دن کے لیے کیا آنا ہے۔ فلاں گھر کی شادی میں کتنے براتی آنے ہیں۔ فلاں شخص کی بیوی اتنے دنوں تک میکے ہی میں کیوں بیٹھی ہوتی ہے۔ اور فلاں شخص کا لگن کیوں نہیں ہو پا رہا۔

کوکھ جلی پوشہ کُج کے لیے اور کوئی مصروفیات تو تھی ہی نہیں، وہ تو بس ہر بہو کو اُس کی ساس کے خلاف بھڑکانے اور ہر ساس کے کان اُس کی بہو کے خلاف بھرنے میں ہی مزہ لیتی رہتی تھی۔ کسی کی دیوارنی کو اُس کی جیٹھانی سے اور کسی کی نند کو اُس کی بھاوج کے خلاف اُبھارنا اور لڑوانا، یہی اُس کی عادت تھی۔ اُسے اگر فکر تھی اپنے جسم کی چنانچہ جسم پالنے میں ہر وقت لگی رہتی تھی۔

اور جب سے واسہ کاک کی بہو آئی ہوئی تھی، پوشہ کُج کے دل میں کرید سی لگ گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی بہانے اس لڑکی کو اپنے یہاں بلا کر اُس سے کئی باتوں کا پتہ چلا لے۔ اُس سے کہدے کہ تیری ساس مغرور ہے۔ اصل میں کمینی ہے لیکن شریف اور سادہ بن رہی ہے۔ اندر سے کچھ اور ہے اور باہر سے کچھ اور۔ تمہیں چاہیئے کہ اس کی چکنی چپڑی باتوں پر نہ جاؤ۔ اس عورت نے جو سلوک اپنی دیوی جیسی ساس کے لئے روا رکھا تھا، کسی اور نے ابھی تک نہ رکھا ہو گا۔ تم جو اس کی دن رات خدمت کر رہی ہو، سب اکارت جائے گا۔ اس کا کوئی بھی فائدہ ملنے والا نہیں......البتہ یہ باتیں ابھی تک پوشہ کُج کے دل ہی میں رہ گئی تھیں کیونکہ یہ لڑکی اسے

اکیلے میں ملی ہی نہ تھی۔

پھر یوں ہوا کہ ایک روز پوشہ گجِ کھڑکی میں دھنسی کسی سوچ میں گم تھی کہ کوئی شخص کہیں سے آکر واسہ کاک کے گھر میں داخل ہوا۔ پوشہ گجِ کو لگا کہ یہ آدمی بڑی ہی رازداری سے گھر کے اندر داخل ہو گیا ہے اور اس نے اپنی بغل میں کوئی چیز اُٹھا رکھی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ پوشہ گجِ کو کرید لگ گئی۔ اس سے پہلے بھی اس نے سُن رکھا تھا کہ ان دنوں واسہ کاک کے گھر میں ایک سے بڑھ کر ایک تحفے آرہے ہیں۔ کیوں آرہے ہیں اور کہاں سے آرہے ہیں یہ کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ اس بات کا پتہ چلا لینا کوئی بھی مشکل کام نہ تھا، اگر واسہ کاک کی بیوی اس قدر گہرے مزاج کی عورت نہ ہوتی۔ وہ اتنی سخت تھی کہ گھر کی باتیں کسی کے آگے بیان نہیں کرتی تھی۔

لیکن پوشہ گجِ بھی کائیاں عورت تھی۔ اُس نے ٹھان رکھی تھی کہ اس بات کا پتہ چلا کر ہی رہے گی۔ سب سے پہلے تو اس نے اپنے خاوند کو ہی کریدنا چاہا کہ واسہ کاک کے یہاں یہ جو الابلا ان دنوں آرہی ہے۔ یہ کون لوگ لا رہے ہیں؟

جاکر ان ہی سے پوچھ لو۔ یہ سودا تیرے سر میں اس وجہ سے سمایا ہوا ہے کہ تو دن بھر بے کار پڑی رہتی ہے۔ تیرا کام تو بس اوروں کے گھروں میں جھانکنا ہی رہ گیا ہے۔" چنانچہ وہ چُپ ہو گئی تھی۔

لیکن آج جو اس نے واسہ کاک کے یہاں ایک اور شخص کو داخل ہوتے دیکھ لیا۔ اُس سے رہا نہ گیا۔ وہ اُٹھ کر واسہ کاک کے یہاں چلی گئی۔ اُس کے وہاں پہنچتے ہی وہ آدمی گھر سے باہر آرہا تھا۔ اب کی بار وہ چیز اُس کے بغل میں نہ تھی۔ پوشہ گجِ جان گئی کہ کوئی چیز اندر چھوڑی گئی ہے۔

پوشہ گجِ اُس آدمی کو غور سے دیکھتی رہی اپنی یادداشت پر زور دیتی رہی، لیکن یہ نہ جان سکی کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آرہا ہوگا۔ چنانچہ مکان کے اندر داخل ہوتے وقت اُسے لگا کہ اندر گھسر پھُسر ہو رہی ہے۔ شاید ان لوگوں نے پوشہ گجِ کو اندر داخل ہوتے دیکھ لیا ہے اور اب وہ چیز چھپانے کی کوشش میں لگے ہیں جو یہ شخص لے کر آیا تھا۔ وہ اب واپس لوٹ بھی نہیں سکتی تھی۔ لہٰذا اندر آکر بیٹھ گئی۔ نظر اُٹھا کر سارے شیلف دیکھ ڈالے لیکن وہاں کچھ نہ ملا۔ ادھر اُدھر کی گپ شپ کے بعد وہ واپس جانا ہی چاہ رہی تھی کہ واسہ کاک کی بہو نے زبردستی روک لیا۔ یہ کہہ کر کہ "ماں جی۔ چائے تیار ہو رہی ہے۔ پی کر چلی جائیں۔" چنانچہ اُس نے چائے بھی پی۔ باتیں بھی خوب کیں۔ لیکن جس بات کی کرید میں یہاں تک آئی تھی وہ بات ابھی تک پوری

نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے تھک ہار کر کھڑی ہو گئی اور گھر لوٹ آئی۔

پوشہ گج کھڑکی میں بیٹھی اسی اُدھیڑ بن میں لگی تھی کہ اُس نے دیکھا واسہ کاک کی بیوی سر پر آنچل ڈالے کہیں جارہی ہے۔ پوشہ گج اُس کے گھر سے نکلتے ہی آڑ میں ہو گئی جب تک کہ وہ گلی سے نکل کر نظروں سے اوجھل ہو گئی چنانچہ ساس کے جانے کے بعد اُس کی بہو بھی میونسپلٹی کینل پر ہاتھ منہ دھونے کے لیے رُک گئی۔ پوشہ گج کو فوراً موقع مل گیا۔ اُس نے کھڑکی پر بیٹھتے ہی بہت ہی میٹھے بولوں سے اُسے پُکارا۔

"بیٹی۔ تم ٹھیک تو ہو؟ تم میرے پاس کیوں نہیں آتی۔ تمہیں چاہیئے کہ ہر شخص کے ساتھ اچھے برتاؤ سے پیش آیا کرو۔ تم تو خیر سے بڑے گھر کی بیٹی ہو۔ تم نے بہت کچھ سیکھ لیا ہو گا۔ وہاں تو یہ چیزیں نہیں دیکھی ہو نگی یا اب ہمارے بیچ رہ کر ہماری جیسی ہو کر رہ گئی ہو۔" بہو اس بات کا کوئی جواب نہ دے پائی۔

"آپ دیکھ رہی ہیں۔ مجھے کام سے فرصت کہاں۔ ویسے تو میرا بھی من کرتا ہے کہ آپ کے یہاں تھوڑی دیر کے لیے آہی جاؤں۔"

پوشہ گج کو لگا کہ لڑکی کے اطوار اچھے ہیں۔ لہٰذا سو جتن کر کے اُسے اوپر اپنے کمرے میں بلالیا۔ اور وہاں بٹھا کر اس سے اُس کے میکے والوں کے بارے میں بہت ساری باتیں پوچھ ڈالیں اور کہا۔ "تمہارے بھاگ پھلے پھولیں۔ ذرا اس پھیرن کی آستین ٹھیک کر دو۔"

بہو بولی "گھر میں دروازہ کُھلا پڑا ہے!"

پوشہ گج بولی۔ اری فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس محلّے میں ہم نے ہر چیز دیکھی ہے۔ البتہ چوری چکاری آج تک ہوتے نہیں دیکھی ہے۔ اور نہ ہی کبھی سنی ہے۔" اس بات سے بہو کی ڈھارس بندھ گئی اور وہ آستین ٹھیک کرنے لگ گئی۔

پوشہ گج کمرے سے باہر جانے لگی کہ بہو نے روک لیا۔

"آپ کہاں جارہی ہیں۔ ماں جی؟"

"میں نے دودھ والے کے یہاں ملائی کے لیے برتن رکھ دیا تھا۔ بس وہی لینے جارہی ہوں۔" وہ بولی "ماں میں چائے نہیں پیوں گی۔" لیکن پوشہ کہاں مانتی، وہ بولی "بھلا ایسا بھی ہوا ہے کہیں۔ نئی نئی بہو آئی ہو۔ تم کہاں روز میرے پاس آتی ہو۔ آج اس طرف آنکلی ہو تو میں بھلا تمہیں چائے پلائے بغیر جانے دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ نکل گئی۔

بہو پھیرن کی آستین پلٹ رہی تھی کہ اچانک اُسے یاد آیا کہ نیچے نل پر وہ اپنا رِسٹ واچ بھول آئی ہے۔ چنانچہ وہ دوڑتی ہوئی گلی میں گئی اور گھڑی لے کر واپس پوشہ کُج کے یہاں جانے والی تھی کہ اچانک اُسے اپنے گھر میں چند سائے سے لہراتے ہوئے نظر آئے۔ وہ زور سے چلائی "وہاں کون ہے بھئی۔ وہاں اندر کون ہے؟" بہو کی آواز سُن کر اڑوس پڑوس کے لوگ بھی چوکنے ہو گئے۔ کئی لوگ اپنے گھروں سے نکل آئے اور یوں شور برپا ہونے لگا۔ لوگ جمع ہوتے گئے۔ واسہ کاک کی بیوی بھی آ گئی اور آتے ہی اُس نے سینہ کوبی شروع کر دی۔

"چور چور" کا شور مچ گیا۔ کسی نے کہہ دیا کہ "بھئی اوپر جا کر دیکھ تو لو۔ تم بھی آخر مرد ہو۔" اس پر کوئی بولا "تم نہیں جانتے۔ جب چور کو اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ اب اُس کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ وہ مرنے مارنے پر اُتر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے اُس کے پاس آہنی سُلاخ ہو۔ جس کسی پر بھی وہ پڑا۔ سمجھو جان سے گیا۔"

اب تو شام چار بھی بج گئے تھے۔ دفتر سے لوگ واپس آنا شروع ہو گئے تھے۔ واسہ کاک کا بیٹا بھی آن پہنوپنچا تھا اور رادھے کاک بھی۔ کافی بھیڑ لگ گئی تھی۔ واسہ کاک کا بیٹا جوان تھا، وہ تو چور کی تاو زدہ مونچھوں سے ڈرنے والا کہاں تھا۔ وہ ہاتھ میں لٹھ لے کر مکان میں گیا۔ اس کے پیچھے واسہ کاک بھی لپکا اور دونوں کو دیکھتے ہی رادھے کاک بھی جوش میں آ گیا۔ چنانچہ پتلی سی چھڑی ہاتھ میں اُٹھا کر یہ کہتا ہوا زینے چڑھنے لگا کہ "اے۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ اب اترو گے بھی یا میں اوپر آ کر تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دوں؟ چور کو ڈھونڈتے ہوئے وہ چھت تک آ گئے تھے۔ چھت پر آ کر رادھے کاک اچانک سرسراہٹ سی سُن لی۔ وہ ایک دم جھپٹا اور چلایا۔

"پکڑ لیا۔ بھئی پکڑ لیا۔ یہ رہا۔ یہاں۔"

واسہ کاک کا جوان بیٹا بھی دوڑتا ہوا اوپر آ گیا۔ اتنی دیر میں باقی لوگ ڈنڈے لے کر نچلی منزل میں کھڑے ہو کر تیار رہے۔ اندھیرے میں ہی واسہ کاک نے چور کو دیکھ لیا تھا اور جھٹ سے اُسے کمر سے پکڑ رکھا تھا۔

دونوں باپ بیٹوں نے چور پر قابو پا کر اُسے ہاتھوں پر اُٹھا لیا اور دھپ سے نچلی منزل میں پھینک دیا۔ "دھپ" کی آواز سُن کر سبھی دوڑ پڑے۔ دیکھا کہ کمرے میں پوشہ کُج اوندھی پڑی تھی۔

رادھے کاک اپنی بیوی کی شکل دیکھ کر پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ گم صم ہو کر سبھی کو دیکھ رہا

تھا۔ واسہ کاک "تراہی۔ تراہی" کہتا ہوا ایک طرف کھسک گیا۔ واسہ کاک کے بیٹے نے ڈنڈا ہاتھ سے چھوڑ دیا اور پوشہ کُج آنکھوں سے کمرے کی چھت کو گھورنے لگی۔ سب چُپ ہو گئے تھے۔

بہت دیر تک جب اوپر سے کوئی آواز نہ آئی تو نیچے کھڑے لوگوں کی بے چینی بڑھنے لگی۔ عورتوں نے پاس کھڑے مردوں سے کہا کہ مہربانی کر کے تم لوگ بھی اوپر جاؤ اور دیکھو کہ کیا معاملہ ہے۔ خیر سے تم مرد ہو اس پر لوگوں کا ایک ہجوم اوپر جانے کے لیے تیار ہوا۔ ایک جم غفیر سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر جانے لگا۔

یہ لوگ اوپر جا رہے تھے کہ وہ تینوں آکر راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔

لوگوں نے پوچھا۔ "کہو جی۔ چور مل گیا؟" جس پر رادھے کاک بولا "جی ہاں۔ پکڑ لیا گیا ہے۔" لیکن اس بات پر لوگوں کی تسلی نہ ہوئی وہ پوچھنے لگے "کون تھا بھئی" اور رادھے کاک بولا

کوئی نہیں جناب۔ بس ایک بلّی تھی۔ برائے مہربانی آپ چلے جائیں۔"

رادھے کاک کی اس بات پر لوگوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ بولے

"آپ سچ بول رہے ہیں؟"

اب واسہ کاک کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ غصے میں بولا

"کیوں؟ ہم جھوٹ کیوں بولیں؟ ایک بار کہہ دیا ہے کہ بلّی تھی۔ صرف بلّی۔ اور کچھ نہیں تھا۔ آپ چلے جائیں بس۔"

لوگ زور کا قہقہہ مار کر جانے لگے اور یوں سارا شور ختم گیا۔

دینا ناتھ نادم

جوابی کارڈ

(1)

"زوُنی دادی۔ زوُنی دادی۔ کیوں دادی ابھی تک اندر ہی بیٹھی ہو؟" اور اس طرح جمال نے اپنی آمد کی اطلاع کر دی اور آتے ہی سبزے پر بے تکلف ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے پھٹے پُرانے پھیرن کی کسی اندر والی جیب سے لنسوار کی ڈبیا نکال لی اور چُٹکی بھر لنسوار انگلیوں میں لے کر اپنے دانتوں پر مل دی۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں چھوٹی سی چھڑی تھی اور اب اُسی سے زمین پر خاکے اُتارنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ دس یا پندرہ منٹ بعد بائیں طرف کے گئوشالے کا دروازہ کُھلنے کی آواز آئی۔ آواز سن کر جمال میر چونک گیا۔ دیکھا تو زوُنی دادی گئوشالے سے باہر آ رہی تھی۔ زوُنی دادی۔۔۔ یوں جیسے پونم کا چاند۔ لیکن اُس کی شکل دیکھتے ہی جمال میر کی ہنسی یوں چھوٹ گئی کہ باچھیں کھل کر اُس کے کانوں تک آ گئیں۔

"دھت تیرے کی۔ میں بھی کہوں کہ کون مردوا یوں صبح سویرے ٹپک پڑا ہے۔" منہ سے انگار برساتی زوُنی دادی کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

زوُنی دادی۔ پورے گاؤں کی نانی اماں اور چھوٹے بڑے سب کی ماں جی۔ زوُنی اماں ۔بُلند قامت وجیہہ خاتون۔ جس کے سر پر برف کی طرح صاف وشفاف سفید بال تھے اور خمار بھری بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ اس کی ناک ستواں تھی اور لمبے لمبے اور پھیلے ہوئے بازو تھے۔ بدن پر سفید لٹھے کا بے داغ پھیرن پہنے کسی پرستان سے آئی مہارانی لگ رہی تھی۔

"کیوں دادی؟ سورج یہاں تک آ گیا ہے اور تم ہو کہ ابھی تک نیند کے مزے لے رہی ہو۔" جمال میر لنسوار آلو بڑا سا تھوک منہ سے اُگلتا ہوا بولا۔

"بڑے بد تمیز ہو اور بے شعور۔ اب تم سے کون بات کرے۔" زوُنی دادی بولی دیکھتے نہیں میں ابھی ابھی گئوشالے سے نکل رہی تھی۔ میں کہاں سوئی پڑی تھی؟"

یہ بات جمال میر کی عقل میں آ گئی اور وہ نادم ہو کر رہ گیا۔ پھر بھی تھوڑی سی ہمت جٹا

کر بولا "کہیں تم گل صاحب کی بناء۔۔۔۔" وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا کیونکہ گل صاحب کا نام آتے ہی زوُنی دادی کا کھلتا ہوا چہرہ خزاں کے پھول کی طرح مرجھانے لگا۔ جمال میر نے بات یہیں پر ختم کر دی۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش کھڑے رہے اور زمین کو گھورتے رہے۔

بالآخر زوُنی دادی نے منھ کھولا اور بولی۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہی ہے۔ میرا جو کچھ بھی ہونا تھا۔ وہ تو ہو ہی گیا ہے۔ لیکن دُکھ صرف بد ی کا ہے۔ اس کی حالت دیکھو تو لگتا ہے کہ گل صاحب کا غم لئے بیٹھی ہے نہ گھاس کھاتی ہے نہ دانہ۔ میں صبح سے اب تک اسی کی خاطر داری میں لگی تھی۔"

اتنے میں اور بھی کئی لوگ گھر میں داخل ہوئے اور باضابطہ دربار سج گیا۔

زوُنی دادی کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ کیا عمر تھی! ان باتوں کی کسی کو خبر نہ تھی البتہ بڑے بڑوں نے زوُنی دادی کو ہمیشہ سے ہی بس ایسا ہی پایا تھا۔

زوُنی دادی اپنے اندر سب کچھ تھی۔ گاؤں کی حاکم اور منصف۔ گاؤں کی مولوی اور تھانے دار، نمبر دار اور چوکیدار، گاؤں کی پٹواری۔۔۔۔ غرض کہ سب کچھ تھی وہ۔ بزرگوں کی مشیر اور چھوٹوں کی ہم جولی۔ ہر ساس کی ہمدرد اور ہر بہو کی رازدار گاؤں میں کوئی بھی تنازعہ کھڑا ہوا تو فیصلہ زوُنی دادی کے ذمے ٹھہرا۔ کسی کے یہاں شادی بیاہ کی بات چلی تو بچولیے کا فرض زوُنی دادی پر آن پڑا۔ اور کہیں کوئی بیمار ہوا تو دوا دارو بھی زوُنی دادی نے ہی تجویز کرنا ہوتا۔ ان اطراف میں مشہور تھا کہ زوُنی دادی کی ہر بات پتھر کی لکیر ہے۔ اُس کے حکم سے انکار کی جُرأت بذات خود وائسرائے سے بھی نہ ہو پاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گاؤں کے سب لوگ زوُنی دادی کے یہاں یوں دوڑے چلے آتے تھے کہ جیسے ننہال جا رہے ہوں۔ جہاں کہیں کسی کے پاؤں میں کانٹا چبھا، دوڑ کر زوُنی کے یہاں چلا آیا۔

(2)

پائیں بستی کو ان کے اطراف میں کوؤں کا گڑھ مانا جاتا ہے۔ وجہ یہ کے اس طرف کے کوے آتے جاتے پائیں بستی کے چناروں پر رات کو رُک جاتے ہیں۔ اور اکثر نے تو ان ہی چناروں میں باضابطہ گھونسلے بھی ڈال رکھے ہیں۔ آج کی شام جب سورج ڈوب رہا تھا، کوؤں نے اس قدر شور برپا کر دیا کہ جھرنے میں بہتے پانیوں کی آواز بھی کوؤں کی کائیں کائیں میں دب کر رہ گئی۔ اچانک گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔ گولی کس نے چلائی؟...... وہاں دیکھو۔ وہ فوجی چلا آرہا ہے۔

ضرور اسی کی کارستانی ہے۔'' آس پاس کے درختوں پر بیٹھے کوے سر جھکائے سوچ رہے تھے۔

فوجی ۔۔۔ تندرست اور وجیہہ، اُبھرا ہوا سینہ، چوڑے شانے، بھرا بھرا چہرہ اور پُر وقار چال لئے یوں جا رہا تھا جیسے فرنگی کپتان ۔ وہ خراماں خراماں جا رہا تھا، کمالِ بے فکری کے ساتھ ۔ بالائی بستی کے نزدیک آتے ہی گاؤں کے بچے اُس کے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ کچھ اس کی ٹانگوں سے لپٹ رہے تھے اور کچھ اس کی جیبیں ٹٹول کر دیکھ رہے تھے۔ کئی ایک نے اس کی بندوق کو اپنے ناخنوں سے کرید کرید کر دیکھنا چاہا تھا۔ سبھی چلا چلا کر گا رہے تھے۔

''زوُنی دادی۔ گُل صاحب۔ گل صاحب جی گُل صاحب۔ آئے ہیں جی۔ گُل صاحب کپتان صاحب، گُل صاحب۔'' یوں بچوں کا یہ جلوس نعرے لگاتا ہوا گل صاحب کے ہمراہ زوُنی کے کوٹ تک آگیا۔ باہر کا شور سُنتے ہی زوُنی دادی گھبرا کر باہر نکلی۔ گُل صاحب کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں خوشی کے ڈورے تیرنے لگے تھے البتہ چہرے پر مصنوعی غُصہ لیتی ہوئی وہ بولی۔

''اونہہ۔ گُل صاحب۔ ٹھینگے کا گُل صاحب۔ ٹھینگے کا کپتان۔ اس جیسے بے وقوف اگر کپتان بننے لگے تو۔۔۔۔'' لیکن اتنی دیر میں دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوگئے تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

گُل صاحب کا زوُنی دادی سے کون سا رشتہ تھا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ ایک گہرا راز تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ گُل صاحب زوُنی دادی کی بھتیجی کا پوتا ہے۔ کوئی اُس کے متبنیٰ بیٹے کا پوتا مانتا تھا۔ لیکن اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ زوُنی دادی اسے مخدوم صاحب کی زیارت گاہ کے باہر سیڑھیوں سے اُٹھا کر گھر لے آئی ہے۔ بہر حال، ان کا آپس میں جو بھی رشتہ ہو، ہمیں اس چیز سے کوئی لینا دینا نہیں۔ پھر بھی ہم مانتے ہیں کہ زوُنی دادی کی آخری سانس صرف گُل صاحب ہی میں اٹکے ہوئے ہیں۔ اُس کی روح گُل صاحب ہی کے شریر میں جا بسی ہے اور جب وہ ملیشیا فوج میں بھرتی ہوا تھا، زوُنی دادی کے لبوں پر صرف گُل صاحب ہی کا نام رہ گیا تھا۔ بات بات پر گُل صاحب۔۔ ہر بات پر گُل صاحب۔۔۔

''واسو جی۔ آپ کو پتہ ہے؟ گُل صاحب کی چٹھی آئی ہے لکھا ہے کہ اُس نے ایک دن میں سترہ قبائلی ہلاک کردئے۔''

''کیا کہوں سونہ مالی: میں اپنے گُل صاحب کی واری۔ آج اُس نے جوابی کارڈ بھیجا

ہے۔ لگتا ہے خط کے اندر موتی پرو کر رکھ دیئے ہیں اُس نے۔"

"جمالے یہ بات تیری سمجھ میں آنے والی نہیں۔ گُل صاحب نے اگلی پچھلی ساری پیڑھیوں کا نام روشن کیا ہے۔ ایک اکیلا پورے کشمیر کی حفاظت کر رہا ہے۔"

(3)

اور جس روز گل صاحب واپس محاذ پر چلا گیا تھا، پورے گاؤں میں چہل پہل تھی۔ سبھی خوش تھے اور منہ اندھیرے ہی سبھی کے گھروں میں چولھے سلگائے گئے تھے۔ اور جب تک سورج نکل آیا تھا، گاؤں کی تمام عورتیں اور مرد زوُنی دادی کے کوٹھے کے گرد جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ ہر شخص ایک نہ ایک سوغات لے کر آیا ہوا تھا۔ کسی کے پاس تبرک تھا اور کسی کے پاس تعویذ، کئی گاؤں والیاں اچار اور چٹنی لے کر آئی تھیں اور کئی شلجم کی ڈوریاں، کسی کے یہاں ساگ تھا اور کسی کے پاس دالیں۔ چنانچہ زوُنی دادی کا دروازہ کھلتے ہی آنے والوں کی دھکم پیل شروع ہوگئی تھی۔

"یہ لیں دادی۔ شلجم کی ڈوریاں ہیں۔ فارمی شلجم کی ہیں۔" رحتی منہ چھپاتی ہوئی قدرے شرما کر بولی۔ "گُل صاحب کی خاطر اپنے گھر والوں سے چُھپا کر لائی ہوں۔"

"آپ یہ سبزی کی ٹوکری بھی رکھ لیں۔ اس میں حسن پور کی کیاروں کا ساگ ہے جو بہار کے موسم میں بنتا ہے۔" رمضو بیگاری بولا "گُل صاحب سے کہہ دیجیو اس قدر لذیذ ساگ پورے علاقے میں ڈھونڈے بھی ملنے والا نہیں۔"

"ذری یہ اچار بھی چکھ کے دیکھ لیجو۔ بائیں بستیوں کی منڈیوں کا اچار ہے۔"

"زوُنی دادی۔ تم گُل صاحب کو جگادو۔" واسو بھٹ بولا۔ "آج کے دن اتنی دیر تک لحاف اوڑھے سونا اچھی بات نہیں۔" اس پر زوُنی دادی بگڑ کر بولی۔

"کیا اناپ شناپ بک رہے ہو۔ واسو جی۔ بھلا وہ ابھی تک لحاف اوڑھے ہی پڑا ہوگا؟ ارے وہ تو کب کا گیا ہوا ہے ندی پر۔ منہ ہاتھ دھونے چلا گیا تھا۔ بس آتا ہی ہوگا۔ تم اتاولے کیوں ہو رہے ہو؟

"تھوڑا سا اُتاولا ہو رہا ہوں۔ میں اپنے کنٹھ جو کے یہاں سے بھوج پتر پر تعویذ لکھوا کر لایا تھا۔ سوچا تھا اپنے ہاتھ سے گُل صاحب کے گلے میں ڈال دوں۔" واسو بھٹ نے صفائی پیش کی۔

ایسے میں گُل صاحب بھی ہاتھ منھ دھو کر آ گیا۔ اُس کے دیکھتے ہی لوگوں نے اُسے پیار دیا۔ گلے سے لگایا اور ماتھا چوم چوم کر دُعائیں دیں۔ اور جس وقت وہ فوجی وردی پہن کر بندوق ہاتھ میں لئے دروازے پر کھڑا ہو گیا، سبھی کے چہرے خوشی سے چمکنے لگے۔ عورتوں نے ہاتھ اُٹھا کر دعائیں دیں کہ ''جا گُل صاحب۔ تیری لمبی عمر ہو، تو پوتوں پھلے، تیرا بخت بیدار رہے، زمانے کی سختیاں تجھ سے دور رہیں۔''

گاؤں کے پورے چار میل تک کا پیدل سفر طے کرتا ہوا اُس کے ساتھ ہو لیا یہاں تک کہ دور چناروں کے جُھنڈ میں اُس کے سائے کھو گئے اور وہ سبھی لوٹ آئے۔

(4)

آج صبح ہی سے آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے جب تک کہ دھوپ کھلتی، بادل اور بھی گہرے ہو گئے۔ گہرے بادل پہاڑیوں کی چوٹیوں سے ٹکرا ٹکرا کر نیچے دامن تک پھیل چکے تھے اور دور مشرق میں بجلی کے کوندے سے لپکنے لگے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ زور کا طوفان آنے والا ہے جو پورے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے مچل رہا ہے۔

اس طرح کے موسم میں لوگ گھروں ہی میں دُبک جاتے ہیں۔ البتہ آج کے دن وہ خلافِ معمول ندی کنارے چھوٹی سی پُلیا کے قریب الگ الگ ٹولیوں میں بٹ گئے تھے اور آپس میں عجیب سی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ سبھی کے چہرے اُترے ہوئے لگ رہے تھے جیسے ڈر گئے ہوں۔ مردوں سے ذرا دور عورتوں کی ٹولی تھی جو اندر ہی اندر غم زدہ سی بیٹھی تھی۔

واسو بھٹ ننگے سر اور ننگے پاؤں ہانپتا ہوا آیا اور آتے ہی بولا۔

''کیا ہوا؟ کریم کاکا۔ یہ کیا ہوا؟ یہ خبر کون دے گیا ہے؟ بات کرتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔

''خاموش'' کریم کاکا اُسے ہاتھ کے اشارے سے روک کر بولا ''ایسے میں ہمارا کام بننے والا نہیں۔ تم بس حوصلہ رکھو۔۔۔ زوُنی دادی کی فکر کرو۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم کس طرح یہ خبر اُس تک پہنچائیں گے۔''

''بھئی۔ مجھے تو بتا دو۔۔۔ یہ خبر کون لے آیا ہے۔ کس نے دی ہے یہ خبر۔''

واسو بھٹ روہانسا ہو کر بولا۔

''کون لے آتا بھئی۔ ہماری تیرہ بختی یہ خبر لے کر آئی ہے۔ کل ڈاکیہ آیا تھا۔ گل

صاحب کا جوابی کارڈ اس نے میرے ہی ہاتھ میں تھما دیا۔ وہی جوابی کارڈ جو زوَنی دادی کے یہاں سے اُس کے نام گیا ہوا تھا۔ وہ واپس آگیا ہے۔ بالکل کورا۔ اُسی حالت میں جیسا ادھر سے گیا تھا۔۔۔ شاید محاذ پر گُل صاحب۔۔۔۔"

کریم آگے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

(5)

آخر گرتے پڑتے یہ لوگ زوَنی دادی کے کوٹھے تک آ ہی گئے تھے۔ زوَنی دادی آج بھی گائے کو چارہ ڈال رہی تھی اور اس سے باتیں بھی کرتی جارہی تھی۔

"تو تو باولی ہو گئی ہے۔ یوں کاہے کو سر دئے بیٹھی ہے۔ تو نے جبھی سے چپ سادھ لی ہے جب سے وہ محاذ پر چلا گیا۔ پر اس سے کیا ہو گا بھلا؟"

وہ گائے سے مخاطب تھی کی ایسے میں واسو بھٹ کے کھانسنے کی آواز آئی

"واسو جی۔ یہ تم۔ کہو کیا بات ہے؟ آج یہ صبح سویرے کیوں نکل آئے۔" زوَنی دادی گئوخانے سے باہر آتے ہوئے بولی۔ "گلو نے ہی گائے کی عادتیں بگاڑ ر دی ہیں۔۔۔ لیکن تم بولو۔ تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ کہیں کوئی واردات ضرور ہو گئی ہے۔ زوَنی دادی نے دروازے کے باہر کھڑے لوگوں کو دیکھ لیا تھا اور ان کی حالت دیکھ کر ڈر سی گئی تھی۔

"بولو بھی۔ کہیں کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا؟ تم بولتے کیوں نہیں؟" سبھی سانس روک کر کھڑے تھے۔

"ارے بھئی منہ سے تو پھوٹو۔ زبان نہیں ہے منہ میں؟"

لیکن اچانک زوَنی دادی کو گُل صاحب کا خیال آیا اور اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔

"کہیں میرا گلو۔۔۔ وہ ٹھیک تو ہے نا۔ تم لوگ کچھ بولتے کیوں نہیں۔" وہ جھلا گئی

تب واسو بھٹ سر جھکائے آگے آیا اور ہکلاتا ہوا بول پڑا

"زوَنی دادی۔ ہم بھی تو آپ ہی کے بچے ہیں۔ بالکل گُل صاحب جیسے" وہ اچانک رو دیا اور اس کے دیکھتے ہی سبھی لوگ رونے لگے۔

"نہیں۔ میرا گلو نہیں۔" وہ زور زور سے چلانے لگی۔ اور وہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ کتنی اولاد کی موت کے بعد۔۔۔ اور کتنے بچوں کے عوض۔۔۔"

واسو بھٹ جی کڑا کر کے زوَنی دادی کے قریب آیا اور اُس کے ہاتھ میں جوابی کارڈ تھما

کربولا

"یہ کل آیا تھا۔ اس پر گُل صاحب کی طرف سے کچھ بھی نہیں لکھا گیا ہے۔ خُدا جانے گُل صاحب۔۔۔"

زوُنی دادی ساکت ہو کر رہ گئی۔ پوسٹ کارڈ لوگوں کی چھینا جھپٹی میں تڑمُڑ کر رہ گیا تھا۔ زوُنی دادی نے کارڈ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اُس پر پڑی سلوٹیں بڑے پیار سے دور کرتی ہوئی بار بار اُلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔

رتن لال شانت

کرفیو

سوم ناتھ نے غلام دین اور اس کی ماتحتی میں شامل گھر آئے سپاہیوں کو اپنے والد کی تحویل میں دے دیا اور خود مکان کی اوپر والی منزل کی اُور بڑھ گیا۔ اُس نے دیوار پر ٹنگی ساری جیبیں کھنگال لیں۔ لیکن صرف تیس پیسے ہاتھ لگے۔ اُسے یاد آیا کہ اُنیسویں تاریخ تھی۔ بیوی سے پیسے مانگنے کا سوال ہی نہ تھا، کیونکہ ہزار کوششوں کے باوجود وہ اسے مطمئن نہ کر سکا تھا کہ مہینے بھر کی تنخواہ کا اُس نے کیا کیا ہے۔ کرفیو لگے آج تیرہواں دن تھا اور ان تیرہ دنوں میں اُس نے اسکول میں ایک کپ چائے کے لیے بھی کوئی پیسہ خرچ نہیں کیا تھا۔ سگریٹ بھی معمول سے نصف ہی پیئے گئے تھے۔ کیونکہ دن میں کم سے کم پانچ گھنٹے اُسے والد صاحب کی حاضری ہی میں گزارنے پڑ رہے تھے۔ اور ان کے سامنے سگریٹ پینے کی وہ جرأت نہیں کر پا رہا تھا۔ والد صاحب کے کمرے کے اندر آتے ہی ساری کھڑکیاں پاٹ دیا کرتے تھے۔ لکڑی کا صندوق دیوار کے ساتھ اچھی طرح جما کر اُس پر کھڑے ہو جاتے تھے اور روشن دان کی دراڑوں سے جھانک جھانک کر باہر کرفیو زدہ سُنسان سڑک کا نظارہ کرتے رہتے تھے۔ پس اُس کی تنخواہ خرچ ہو گئی، تو کس مد میں؟ گھوم پھر کر وہ اپنے آپ کو سمجھاتا تھا کہ اصل میں کرفیو کی وجہ سے گھر کے ہر فرد کا دھیان پیٹ کی طرف کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ہے۔ خود ہی اُس نے کم سے کم بارہ مرتبہ بازار سے گوشت منگوایا ہے، وہ بھی باہر کھڑے سپاہیوں کے ہاتھوں ان کی منت سماجت کر کے یا مختلف حیلے بہانوں سے۔ بے کاری کی بنا پر یہاں تقریباً ہر شخص کی جسمانی حرارت بڑھ گئی ہے۔ اس وجہ سے گھر میں دہی کا رائتا بھی شروع ہو گیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ لوگوں کے چاول بھی ہضم نہیں ہو نے پا رہے تھے، اب یوں ہے کہ گندم کی روٹیاں پچانے کی خاطر چھٹانگ بھر گھی منگوانا بھی ضروری ہو گیا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ ایک وہی شخص تھا جو گھر میں بے کار ہو کر رہ گیا تھا۔ ورنہ اُس کی

بیوی اور ماں دونوں الگ الگ کھڑکیوں میں براجمان ہو کر دن بھر باہر کی زندگی کا لطف لینے میں روز کی طرح آج بھی سر گرم تھیں۔ والد صاحب تو روشندان سے جھانک جھانک کر اس کی کومینٹری سنانے میں خاصا لطف لیتے تھے۔ بس وہی ایک شخص تھا جسے دن بھر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھنے، اپنی کمر کی جلد اور دیوار کا پلاسٹر دونوں کو رگڑ رگڑ کر اتارنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اور مجبوری کی یہ منطق بھی اُس نے اپنے ہی دل میں چُھپا کر رکھ لی تھی، بیوی کے سامنے اس کا اظہار بھی نہ کیا تھا اور نہ ہی اس کی طرف سے اس بارے میں پوچھنے کی ضرورت سمجھی گئی تھی۔

اور اب جبکہ جیب میں صرف تیس پیسے پائے گئے۔ سوم ناتھ کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ تو یہ بھی نہ کر سکا کہ جا کر غلام دین سے صاف کہہ دے کے بھائی چائے تو بن گئی ہے۔ لیکن تم کو بغیر روٹی کے پینی ہوگی۔ والد صاحب ان کے سامنے ہاتھ پھیلانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ سوچنے لگا کہ ناحق آج صبح غلام دین کے گلے پڑ گیا اور اُسے گھر آنے کی خاطر اس قدر مجبور کیا۔

غلام دین اُس کے اولین شاگردوں میں سے ایک تھا۔ اُس کی ڈیوٹی جن دنوں ٹپن کے اسکول میں لگی تھی۔ غلام دین اسکول کا واحد لڑکا تھا جس کے لئے سرکاری جیپ صبح و شام بلاناغہ اسکول کے دروازے تک آتی تھی۔ صبح اسے چھوڑ کر شام کو واپس لینے کے لیے آتی تھی۔ سوم ناتھ خود بھی اُسی جیپ میں بیٹھ کر کئی بار ٹپن سے سری نگر آ چکا تھا۔ وہ اگر کامیاب اُستاد تھا تو اس کی کامیابی میں سوم ناتھ سے زیادہ اس بارسوخ لڑکے کا ہاتھ تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اپنے پیشے سے زیادہ وہ اس لڑکے کا لحاظ رکھتا تھا۔ غلام دین میٹرک کا امتحان پاس نہیں کر سکا تھا اور اس کا افسوس سوم ناتھ کو غلام دین سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ کیونکہ غلام دین کے اس پر کئی طرح کے احسان تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ غلام دین ہی کہ مدد سے اس کا تبادلہ ٹپن سے سری نگر ہوا تھا۔ چنانچہ آج صبح اُس نے غلام دین کو دیکھ لیا تو اس سے منہ نہ پھیر سکا تھا۔

اُسے دیکھ کر تو وہ پہلے حیران رہ گیا۔ کہاں تب کا وہ غلام دین اور کہاں آج کا یہ پولیس افسر جو کم سے کم دو درجن سپاہیوں کو اپنی ماتحتی میں لے کر یہاں ڈیوٹی دے رہا تھا۔ سوم ناتھ نے اُسے دیکھ کر مکان کی اوپر والی منزل سے ہی پکار کر کہہ دیا تھا کہ اوپر آ جاؤ رات کی ڈیوٹی کی بنا پر تمہیں رت جگا کرنا پڑ گیا ہوگا۔ یہاں گھر میں چائے بنے گی۔ چائے پی کر ہی چلے جاؤ۔۔۔ اس پر اس کے گلے ہی پڑ گیا تھا۔۔۔ اور جب وہ اوپر آ ہی گیا تھا تو غلام دین کے پاس بازار سے روٹی منگوانے کی خاطر پیسے نہیں تھے۔ تیس پیسے میں صرف دودھ آ سکتا تھا۔ اور لے دے کر ایک راستہ تھا کہ ماں

سے پیسے مانگے جاتے۔ اور ماں سے بات کرنے پر جواب ملا کہ "ساری کھڑکیاں اور دروازے اُسے دکھا دینا۔ ٹوٹے شیشوں کی کرچیاں بھی اُسی کے سامنے رکھ دینا اور سب کچھ اُسے سمجھا دینا۔"

اُس نے ماں سے ڈانٹ کر کہہ دیا تھا "کیا ضروری ہے اس کے سامنے وہی بات بتانے کی جو اس پر کھلنی نہیں چاہیئے۔"

یہ شیشے کرفیو سے ایک روز پہلے جلوس میں شامل لوگوں نے توڑ ڈالے تھے۔ سوم ناتھ دنیا والوں سے چھپ کر جینا چاہتا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ لوگوں کو اس بات کا پتہ چل جائے کے سوم ناتھ کا مکان سڑک کے کنارے ہے اور جلوس نکلنے کے دن اُس کا نقصان ہوا ہے۔ کہیں سے ادھار مانگ کر اس نے کھڑکیوں کی مرمت بھی کروالی ہوتی۔ شیشے بھی لگوالئے ہوتے۔ لیکن کرفیو لگا تھا۔ ایک گھنٹے کے لیے کرفیو میں ڈھیل دی جاتی تھی اور اس دوران صرف دودھ سبزی اور روٹی بیچنے والوں کی دکانیں کھلتی تھیں۔ شیشے والوں کی دوکانیں بند ہی رہتی تھیں۔ اور شہر کے جس حصے میں دن بھر کے لیے بازار کھلتے تھے۔ وہاں جانے کے لیے کرفیو پاس ضروری تھا اور کرفیو پاس ٹیچر کو نہیں دیئے جاتے تھے۔ سوم ناتھ اس روز کا خیال کرتے ہوئے بھی گھبرا جاتا تھا کہ جس دن کرفیو اُٹھائے جانے کے بعد دکانیں کُھل جائیں گی اور لوگوں کی بھیڑ اُس کے مکان کے آگے جمع ہو جائے گی اور لوگ کہیں گے کہ اس مکان کی کھڑکیاں توڑی گئی ہیں۔ ان پر پتھراؤ کیا گیا ہے۔ اور جب وہ خود بھی بھیڑ میں شامل ہو کر لوگوں سے اس پتھراؤ کی وجہ پوچھے گا۔ تو کہا جائے گا کہ یہاں سے جلوس پر پتھر پھینکا گیا تھا۔ اس پر کھولتا ہوا گرم پانی ڈالا گیا تھا۔ تیزاب کی بوتلیں پھینکی گئی تھیں، وہ ان سے یہ بھی نہ کہہ سکے گا کہ مکان کے اندر اُس وقت میری بوڑھی نانی تھی جو چلنے سے معذور ہے۔ وہی اپنے آپ کو گھسیٹ کر کھڑکی تک لے گئی تھی اور اُسی نے پیشاب بھری چلمچی کھڑکی سے باہر پھینک دی تھی۔ ہڑتال کی خبر سُن کر تو اس کی بیوی گھبرائی تھی اور گھبرا کر اپنی جان ہتھیلی پر لئے بچوں کو لینے کی خاطر اسکول دوڑ گئی تھی۔ سوم ناتھ کا باپ حبہ کدل میں کھڑا جلوس میں شامل افراد کے نعروں کا جواب دے رہا تھا۔ اور اب وہ بیوی کے زیور بیچ کر بھی کھڑکیاں اور دروازے بنوانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ لیکن کرفیو کا کیا کیا جاتا۔

اور اب جبکہ اُس کا دوست اور شاگرد، غلام دین جو خود بھی ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اس کے گھر میں بیٹھا ہے، کیا یہ ٹھیک رہے گا کہ اس وقت اُس کے سامنے اپنا دُکھڑا روئے؟ ہرگز

نہیں۔ چنانچہ جب ماں نے ٹوٹی کھڑکیاں دکھانے کا اصرار کیا، سوم ناتھ نے اُسے ڈانٹ دیا۔ ماں کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن سوم ناتھ پیسے لے کر نیچے آ گیا۔

یہاں آکر اُس نے دور سے ہی غلام دین اور اپنے والد کی باتیں سُن لیں۔ وہاں کرفیو میں پولیس والوں کا رول زیر بحث تھا۔ سوم ناتھ نے سوچا کہ اندر جا کر وہ بات ختم کرنے یا موضوع بدلنے کی کوشش نہیں کرے گا، تو خطرہ ہے لالہ کیا سے کیا بول دے۔

لالہ کہہ رہا تھا "جناب کشمیری تو بہر حال کشمیری ہی ہیں۔ باہر کے یہ پولیس والے سچ مُچ کے سؤر ہیں۔ یہ کھڑکی سے باہر گندہ پانی بھی پھینکنے نہیں دیتے۔ اس قدر شور مچاتے ہیں کہ بچے سہم جاتے ہیں اور کونوں میں دُبک جاتے ہیں۔"

لیکن سوم ناتھ جانتا تھا کہ غلام دین اتنا بھی نہیں ہے کہ وہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ پائے گا۔ لالہ کے بات کرنے کا انداز اس قدر بناوٹی تھا کہ سب جھوٹ کی حقیقت بالکل سامنے آرہی تھی۔ یہ سچ ہے کہ باہر کی پولیس کئی معاملوں میں سختی برتتی تھی۔ انہوں نے سڑک پر کوڑا پھینکنے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ سوم ناتھ کے والد مجبور تھے کہ وہ کرفیو کھلتے ہی گھر کا سارا کوڑا کرکٹ دور ندی میں پھینک آئے تھے۔ بہر حال اس میں کوئی بھی بُرائی نہ تھی سڑک پر کوڑا ڈالنے سے پرہیز اچھی بات ہے۔ خاص طور سے ان دنوں جب سڑکوں کی صفائی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ کوڑا پھینکنے کی حد تک تو لالہ کی بات صحیح تھی لیکن جہاں تک سپاہیوں کے شور سے بچوں کے کانپ اُٹھنے کا سوال ہے، یہ سراسر جھوٹ تھا۔ یہ لوگ تو دن بھر محلے کے بچوں کے ساتھ گپیں ہانکا کرتے تھے۔ لڑکے اپنے گھر کے دروازوں سے باہر آکر ان سے ان کی وردی سے متعلق باتیں کرتے اور ان کی ٹوپیاں اٹھا کر اپنے سر پر رکھتے تھے۔ ان کی بندوق کو چھونے کی خاطر ان سے دوستی گانٹھتے تھے۔ انہیں کشمیری زبان سکھاتے اور پانچ پیسے کا سکہ ان کے ہاتھ میں دے کر ان سے مٹھائی منگواتے تھے۔ بچوں سے پیسہ لے کر یہ لوگ دکان دار کے پاس جاتے، کواڑ بجا کر اُس سے دکان کھلواتے اور مٹھائی یا چنے لے کر واپس آجاتے تھے۔ سوم ناتھ کا چھوٹا بیٹا اوپر جا کر لیفٹ رائٹ کر کے چھت کے دو دو گرہ دباتا پھرتا تھا۔ کاندھے پر چھڑی رکھ کر گھر کے ہر فرد کو مارتا جاتا تھا اور کہتا تھا "ہم چھوٹا ہے۔ پردیش ہے، تم کدھر جاتا ہے، بھاگو۔۔ ہم گولی لائے گا۔"

سوم ناتھ نے دخل دے کر دونوں کی بات ختم کرنا چاہی۔ نہ معلوم لالہ کیا بول دے

لیکن غلادین فوراً بول اُٹھا "فکر نہ کریں مہاراج بہت جلدی ان کی بدلی ہو رہی ہے۔ شہر میں اب کرفیو کے دوران کشمیری پولیس ہی کی ڈیوٹی لگ جائے گی۔ سوم ناتھ یہ سُن کر حیران رہ گیا۔ سوچنے لگا کہ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ پھر بھی اگر یہی ہونا ہے تو اس انسپکٹر کو کیسے معلوم۔ لیکن پھر سوچا کہ یہ ایک با رسوخ آدمی کا بیٹا ہے۔ اسی نے مجھے ٹرانسفر کروایا تھا۔ میٹرک میں کبھی بھی پاس نہ ہو سکا لیکن ایک ہی سال کے اندر انسپکٹر ہو گیا۔ بہت ممکن ہے کہ ایسا ہو جائے۔ یہ سوچتے ہوئے اس کی نظر کمرے کی کھڑکیوں تک گئی۔ جنگ جس وقت ہو رہی تھی وہ خود گھر پر نہیں تھا۔ لیکن دادی کہہ رہی تھیں کہ کشمیری پولس اُس وقت سڑک پر موجود تھی اور پہلا پتھر پولس والے نے ہی مارا تھا۔

لیکن یہ بات سُنتے ہی لالہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ کھوکھلے سے لہجے میں وہ انسپکٹر سے بولا "نہیں جناب یہ کیسے ہو گا؟ پھر کس بات کے لیے ان کو مدھیہ پردیش سے بلوایا گیا ہے۔ واپس ہی اگر کرنا تھا تو یہاں تعینات کیوں کئے گئے تھے۔۔۔؟ اور اس میں ایک قانونی نکتہ بھی ہے۔"

لالہ نے اپنی ناک پر سے عینک اتار لی اور اسے صاف کرنے کے بہانے لمبی سی جرح کے بعد دم لینے کے لئے رک گیا۔ لیکن سوم ناتھ دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں کے دیدے بار بار گھوم رہے تھے۔ جن سے اس کے اندر کا خوف واضح تھا۔ بہر حال وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا "انہیں اگر اس بات کی بھنک بھی مل جائے کہ بداعتمادی کی بنا پر انہیں واپس کیا جا رہا ہے، ممکن ہے یہ لوگ بغاوت پر اُتر آئیں۔"

لالہ ایسے بول رہے تھے کہ لگتا تھا کہ سپاہی ضرور بغاوت کر دیں گے۔ وہ بہ حیثیت ایک ٹریڈ یونین لیڈر کے ایک افسر کو دھمکی دے رہے تھے کہ اپنے جابرانہ اقدام سے تم کو باز رہنے پر مجبور کیا جائے گا۔

سوم ناتھ نے یہ نہیں دیکھا کہ غلام دین کے چہرے پر ان باتوں کا کیا ردعمل ہوا۔ اُسے یاد آیا کہ اُس نے کہیں سے سُن رکھا تھا کہ کشمیر اور غیر کشمیری پولیس کے دوران آج کل چپقلش سی چل رہی ہے اور یہ باتیں سُنتے ہی اُس کے پسینے چھوٹنے لگتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایسا ہونے کی صورت میں اُس جیسے بے شمار لوگ ناحق روندے جائیں گے۔ لیکن لالہ کی بے تکی سُن سُن کر اس کا کلیجہ جل رہا تھا۔ اُس کا مکان دو سڑکوں کے سنگم پر واقع تھا۔ یوں سمجھو تکون کی

ایک نوک پر۔ اس کے آگے بھی سڑک تھی اور پیچھے بھی۔ ایک دروازہ آگے کی طرف کُھلتا تھا اور دوسرا پچھواڑے میں۔ محلے کا سب سے اگلا مکان بھی یہی تھا۔ اور جس دن جلوس نکلا تھا پہلے پتھر کا نشانہ بھی یہی بن گیا تھا۔ اتنے پتھر آئے تھے کہ اس کی کوئی کھڑکی یا دروازہ سالم نہ رہ گیا تھا۔ کرفیو جب لگ گیا تو سب سے بڑی آفت اسی گھر کے مکینوں پر نازل ہوئی۔ آگے سڑک اور پیچھے سڑک۔ آگے بھی سپاہی اور پیچھے بھی۔ ایک طرح سے یہ لوگ نظر بند کئے ہوئے تھے۔ گلی میں رہنے والے پھر بھی گلیوں سے نکل کر پورا شہر گھوم آتے تھے اور پولیس والوں کی ارواح کو اس بات کی خبر نہ ہو پاتی تھی۔ اور کرفیو اس قدر کا تھا کہ سڑکیں خالی تھیں۔ کتے بھی غائب تھے۔ اور سوم ناتھ ہی جانتا تھا کہ سڑک کے اس پار جانے کی خاطر اُسے پولس والوں کی کس قدر منتیں کرنا پڑتی تھیں۔ لالہ نے تو ان تیرہ دنوں میں کھڑکی پاٹ کر صندوق پر کھڑا ہو جاتا تھا اور روشن دان سے جھانک کر کومینٹری کر تا رہتا تھا۔ اور سوم ناتھ کا کلیجہ اسی بات سے جل رہا تھا کہ "اگر ان کو واپس بلوا لیا گیا، یہ لوگ ضرور بغاوت کر دیں گے۔" آخر کیا ہمدردی ہے لالہ کو ان لوگوں کے ساتھ؟

غلام دین نے بڑے آرام سے لالہ کی باتوں کا جواب دیا "نہیں مہاراج یہاں ان کی نہیں چلے گی۔ یہ لوگ ایسا کرنے کی یہاں جرأت نہیں کریں گے۔" سوم ناتھ نے یقین کر لیا اور غلام دین کہہ رہا تھا "دیکھئے مہاراج۔ رات میں دن سے بھی زیادہ خطرہ رہتا ہے۔ ہر سڑک ہر رات کو کشمیر پولیس ہی کی ڈیوٹی لگا دی گئی ہے۔ ہم لوگ جونہی نایٹ ڈیوٹی ختم کرتے ہیں یہ لوگ دن کی خاطر آ جاتے ہیں۔ لیکن دن میں بھی یہ لوگ کیا کرتے رہتے ہیں، سبھی جانتے ہیں۔ آپ بھی تو دیکھتے ہی ہونگے، راؤنڈ مارنے کی بجائے یہ لوگ گپ شپ میں لگے رہتے ہیں۔ اور ہم لوگ ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹتے ہیں۔ آپ نے کبھی سُنا بھی ہے کہ رات کے وقت کہیں کوئی واردات ہوتی ہے؟

سوم ناتھ انکار میں زور زور سر ہلانے لگا۔ اور سوچنے لگا کہ لالہ کہیں ایک اور قانونی نکتہ لے کر نہ بیٹھے۔ چنانچہ بات بدلنے کی غرض سے وہ غلام دین سے کہنے لگا۔ "ہمارے لئے تو اور بھی کٹھن ہو گیا ہے۔ آگے بھی سڑک اور پیچھے بھی۔ چند روز سے کرفیو میں ایک گھنٹے کی ڈھیل دی جاتی ہے اور اس وجہ سے قدرے آسانی ہے۔ پھر بھی وقت بے وقت کبھی نہ کبھی کسی چیز کی ضرورت آن پڑتی ہے۔"

غلام دین بولا" مہاراج آپ نے مجھے خبر کیوں نہ کی۔ میں سپاہی کے ہاتھوں ساری چیزیں آپ کو بھجوا دیتا۔ کیوں ٹیکا لال ؟"

غلام دین کے ساتھ آئے سپاہی ہر بات کی حامی بھرنے کے عادی تھے۔ اور یہ بات سن کر بھی اُن میں سے ایک نے حامی بھری، جس کی شکل سوم ناتھ کو دیکھی ہوئی لگتی تھی۔ اس کے ماتھے پر سیندور کا بڑا سا ٹیکہ لگا ہوا تھا اور اسی کو ٹیکہ لال کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔

"جی ہاں جناب۔ میں تو رجب صاحب کی خاطر ہر روز امیدا کدل سے گوشت لاتا ہوں۔ اب ان کی دو چار چیزیں اٹھا کر کون سی محنت کرنی پڑے گی۔۔۔۔"

رجب صاحب سڑک کے اُس پار سوم ناتھ کی ہمسائیگی میں رہتے تھے۔ کرفیو لگنے سے ایک روز پہلے ہی یہ لوگ مکان چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔ حالانکہ سوم ناتھ کے علاوہ بھی کئی ہمسایوں نے انہیں اپنے ہی گھر کے اندر رہنے کی تلقین بھی کی تھی۔ چنانچہ کل ہی یہ لوگ واپس بھی آ گئے تھے۔ سوم ناتھ نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ کوئی پنڈت پولس والا ان کے گھر کی حفاظت پر مامور ہے۔ اور جب ابھی ٹیکا لال کی زبانی اُس نے یہ بھی سن لیا کہ ان کے لئے امیدا کدل سے گوشت لے آتا ہے، تو ساری بات صاف ہو گئی تھی۔ سوم ناتھ مطمئن تھا کہ بہر حال وہ لالہ اور غلام دین کا دھیان پچھلی باتوں سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

لالہ نے منھ کھولنا ہی چاہا تھا کہ غلام دین نے سوم ناتھ سے شکایت کرتے ہوئے کہا "کیوں ماسٹر جی۔ آپ ہمیں بھول ہی گئے۔ کل رات کو کم از کم ہم سے پوچھ ہی لیتے کہ نایٹ ڈیوٹی لگی ہے۔ آرام تو نہیں کرنا ہے۔ ویسے بھی ہم پچھلے کئی روز سے رات کو جاگے رہتے ہیں۔ اور اب اس کی عادت سی ہونے لگی ہے۔" اس پر ٹیکا لال نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا "کہاں جناب دکانوں کے تھڑوں پر تو ٹھیک سے لیٹا نہیں جاسکتا۔ میری پسلیاں اب بھی دکھ رہی ہیں۔۔۔۔" لیکن سوم ناتھ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا" مجھے کیا معلوم کہ آپ پولیس میں بھرتی ہو گئے ہیں۔ اور یہ کہ اسی علاقے میں ڈیوٹی بھی لگی ہے۔ لیکن آپ نے میرا مکان دیکھ لیا تھا۔ کم از کم دروازہ ہی کھٹکھٹاتے۔"

سوم ناتھ کو احساس تھا کہ وہ صریحاً جھوٹ بول رہا ہے۔ ورنہ جب بھی سڑک پر سپاہیوں کی ڈیوٹی بدل جاتی تھی، ان کے لئے کھانا آتا تھا یا جب بھی وہ کسی کو بغیر پاس لئے گھومتے ہوئے پکڑ لیتے تھے، سوم ناتھ اور اس کے گھر والوں کو پل پل کی خبر ہوتی تھی۔ وہ ہر لمحے اور

واقعے کی شہادت پیش کر سکتے تھے۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھنا ان کا دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا اور کل شام کو جب پہلی بار ان کے دیکھتے ہی دیکھتے کشمیر پولیس آئی تھی۔ جب وہ لڑکوں سے کود کود کر کشمیری زبان میں باتیں کرنے لگے تھے تو دادی اماں کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اور لالہ یہ کہہ کر بستر میں دبک گئے تھے کہ "اب مجھے جگانے کی کوشش نہ کرنا۔ دن میں ایک پل کے لیے بھی نہیں سویا ہوں۔" سوم ناتھ کمرے کی بتیاں بجھا کر کھڑکی سے جھانکتا رہا تھا۔ اور اسی وقت اُس نے غلام دین کی آواز بھی پہچان لی تھی۔ وہ جان گیا تھا کہ خود اسی کی پیشن گوئی آج پوری ہو کر رہ گئی ہے۔ سکول کے دنوں میں غلام دین کے اطوار دیکھ کر غلام دین کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ لڑکا ایک کامیاب پولیس افسر بن سکتا ہے۔ اُسے یقین تھا کہ جو لڑکے اپنے لڑکپن میں پولیس کے لئے مسائل پیدا کرتے ہیں وہی لڑکے بڑے ہو کر کامیاب پولیس والے بھی بن جاتے ہیں۔ جب اس نے غلام دین کو پولیس کی وردی میں دیکھ لیا تھا، مصلحتاً کھڑکی پاٹ دی تھی۔ اور جب صبح کو اس سے آمنا سامنا ہوا تھا تو بات کئے بنا چارہ نہیں رہ گیا تھا۔"

"ماسٹر جی۔ میں بس یوں ہی کہہ رہا تھا۔ رجب صاحب کے یہاں میرا بستر جانے کب سے لگا دیا گیا تھا۔ آپ شاید نہیں جانتے کہ رجب صاحب کے ساتھ ہمارے تعلقات کس قدر گہرے ہیں۔ وہ میرے والد صاحب کے قریبی دوست ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا اُن سے تنظیمی رشتہ بھی ہے۔" سوم ناتھ جب سے بڑا ہوا تھا اُس نے رجب صاحب کو محلے کا پریسیڈنٹ ہی دیکھا تھا۔ ہر سال یہ لوگ اپنے مکان کی ایک ایک منزل بڑھاتے جا رہے تھے یا اُس کا دالان تعمیر کرتے تھے رنگ چڑھاتے تھے یا چھت بدلتے تھے۔ حاجی محمد رجب صاحب عام طور پر رجب گوجری کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ ان کا ایک بیٹا ڈاکٹر تھا اور دوسرا ٹھیکے دار۔ تین لڑکے اسکول اور کالج میں پڑھتے تھے۔ ان کا گھر ہر طرح سے آباد تھا۔ اور آج بھی رجب صاحب دستخط کرتے وقت اپنا نام آخری حرف سے شروع کرتے تھے۔ اس کے بعد آدھی جیم لکھتے تھے اور بعد میں اس کے آگے ڈالتے تھے۔ یعنی ر ج ب کی بجائے ب ج ر۔ بجر۔ ٹیکا لال اور دوسرے سپاہی جماہیاں لینے لگے اور سوم ناتھ کو خیال آیا کہ ایک روپیہ وہ ابھی اس کی جیب ہی میں ہے اور اُس نے بازار سے روٹی بھی منگوانی ہے۔ چنانچہ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ غلام دین بولا

"ماسٹر جی۔ اب ہم چلتے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں رہے گا کہ ہم لوگ یہاں چائے پینے کے لیے بیٹھ جاتے۔" اس پر سوم ناتھ بناوٹی غصہ اور نقلی پیار جتلا کر قدرے اصرار کرتے ہوئے بولا

''نہیں بھئی۔ کہاں جانے دوں گا۔ دیکھتا ہوں میں بھی کیسے جاتے ہو آپ لوگ۔ میرا کہنا کیسے ٹالو گے۔ تم تو میرے لیے اب بھی وہی طالب علم ہو جو ٹپن کے ہائی اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔''

غلام دین کھڑا ہونے کی جرأت نہ کر سکا۔ چنانچہ سوم ناتھ ہی چل دیا۔ وہ اٹھ کر نیچے آگیا۔ تھوڑی دیر تک دروازے پر رُک گیا۔ اور جب پہرے پر کھڑے سپاہی کی نظر اُس پر پڑی۔ وہ طنزیہ انداز میں مسکرا کر بول اٹھا۔

''کاہے پنڈت صاحب۔ خوب بنا رہے ہیں انسپکٹر صاحب کو سپاہی کی آنکھوں میں شرارت تھی اور لہجے میں طنز۔

''کیا کریں بھائی سب کرنا پڑتا ہے۔'' سوم ناتھ نے مختصر لیکن بامعنی بات کہہ دی۔ وہ خوش تھا کہ سپاہی کو اس نے اشارتاً سمجھا دیا تھا اور کھل کر کچھ نہ کہا تھا۔ اور اب تک بات کی تہہ تک پہنچنا اسی کا کام ہے۔ سپاہی مسکرا کر چلنے لگا تو سوم ناتھ نے آواز دی۔

''ارے بھائی شیاماچرن۔ یہ ایک روپیہ ہے۔، ذرا مہربانی کرنا۔ ایک سیر دودھ لے آو اور باقی پیسوں کے کُلچے۔ آپ کو ضرور کشٹ ہو گا لیکن۔۔۔۔۔''

''۔۔۔۔سب کرنا پڑتا ہے۔'' سپاہی اس کی بات کاٹ کر بول اٹھا۔

''اچھا۔ چائے پلائی جا رہی ہے، مولانا صاحب کو۔'' مولانا کا لفظ اس نے زور دے کر کہا اور سوم ناتھ کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی بول پڑا۔

''کاہے کا کشٹ پنڈت جی۔ لائیے۔'' سوم ناتھ کے ہاتھ سے روپیہ اور لوٹا لے کر سپاہی دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ دور کوئی شخص سڑک پار جانے کی کوشش کر رہا تھا اُسے دیکھ کر سارے سپاہی جیسے نیند سے جاگ گئے تھے۔ چنانچہ سڑک سے ڈنڈے بجا بجا کر ایک جُٹ ہو کر وہ اُسی طرف لپکنے لگے۔ لیکن سپاہی شیاماچرن بڑے اطمینان سے سڑک پار کر گیا اور ایک گلی میں مڑ گیا۔ سوم ناتھ دروازہ پاٹ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔

سڑک کے اُس پار ایک گلی میں نانبائی کی دکان تھی اور دودھ بیچنے والی تھی۔ دونوں کے ہوتے ہوئے اُس پار رہنے والوں کی سہولیات میسر تھیں۔ برعکس اُن کے سوم ناتھ کا مکان نہ تو اُس پار کے بازار سے منسلک تھا اور نہ ہی اس پار کی دکانوں سے۔ چنانچہ اب ان ہی سپاہیوں پر تکیہ تھا اور یہی لوگ ضرورت کی چیزیں لا کر دیتے تھے اور یوں ان کا کام بھی بن جاتا تھا۔

"یہ لیجئے پنڈت جی۔" سپاہی شیاماچرن دودھ اور کلچے سوم ناتھ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولا۔ وہ یہ چیزیں لے کر اوپر چلا آیا۔ یہ دیکھنے کہ چائے کہاں تک پک گئی ہے اندر جاکر دیکھا تو چائے کے بدلے ایک اور ہی مسئلہ پکنے لگا تھا۔ دادی اماں مصر تھیں کہ جن برتنوں میں ان لوگوں کے لیے چائے جائے گی۔ وہ سارے برتن توڑ کر پھینک دئے جائیں گے اور گھر میں نہیں رہیں گے۔ سوم ناتھ کی بیوی اس پر پریشان تھی کہ آخر چائے کیسے جائے گی۔ الماری کی چابیاں اُس کے ہاتھ نہیں آرہی تھیں۔ ان لوگوں کو کہاں خبر ہوگی کہ ان کی پیالیوں میں کون چائے پی گیا ہے۔ چنانچہ سوم ناتھ کی بیوی کھڑکی میں کھڑی شمبھوناتھ کی بہو کا نام لے لے کر پکارتی رہی۔ شمبھوناتھ کا مکان اُس پار تھا اور کرفیو کی خاموشی میں یوں پُکارا جانا آسان نہ تھا۔ چنانچہ اُس کے پکارتے ہی آس پاس کے مکانوں کے مکین نکل آئے تھے۔

"ایک ذرا اپنا ٹی سیٹ دیجو۔ میری الماری کی چابیاں کہیں رہ گئیں ہیں۔ ڈھونڈے سے نہیں مل رہی ہیں۔ ان کے کوئی دوست ہیں۔ پولیس میں انسپکٹر ہیں۔ غلام دین صاحب۔ سنا ہے بڑا رسوخ رکھتے ہیں۔ ہم سے کہہ رہے تھے کہ ہمارے لئے سرکاری جیپ کا انتظام کروائیں گے۔ ہم جہاں چاہیں بغیر کسی رکاوٹ کے آجاسکیں گے۔ تم ہی بتاؤ۔ ان لوگوں کو پیتل کی پیالیوں میں چائے پلانا ٹھیک رہے گا؟" اُس نے غلام دین کا نام زور دے کر کہا تھا۔ اور کرفیو کی خاموشی میں یہ نام دور تک گونجتارہ گیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ نام رجب گوجری کے مکان تک بھی جاتا لیکن اس کا امکان بہت کم تھا۔ البتہ جن لوگوں تک ان کی آواز گئی تھی انہوں نے نام سنتے ہی اپنی کھڑکیاں بند کرلی تھیں۔ اس بار اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ پھر بھی لہجے میں نرمی لاتی ہوئی وہ بولی "ہمارے یہاں ٹی سیٹ کا کوئی بھی برتن سالم نہیں ہے۔ سب ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے کھڑکی کا پاٹ دی اور اندر چلی گئی سوم ناتھ کی بیوی نیچے آگئی اور ساری بات سوم ناتھ کو بتادی۔"

"ان لوگوں کو نہ جانے کیا ہوا ہے۔ اب کیا کریں؟"

سوم ناتھ کی بھی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اُس کے ہمسایوں کا کیا ہوا ہے اور اب وہ کیا کرے۔ چنانچہ بغیر کچھ بولے وہ نیچے آگیا اور اُسی پولیس والے کو پکارنے لگا۔

بھائی شیاماچرن بہت ضروری کام پڑا ہے۔ پار جانا ہے ذرا جلدی ہے۔ مہربانی کرکے ادھر والی سڑک سے میرے پاس رہنا یا میرے ساتھ ساتھ رہنا۔"

اس پر شیاما چرن مسکرا کر بولا "ارے پنڈت جی کہاں جایئے گا۔ ہم تو کب سے چائے کا انتظار کر رہے ہیں۔ آج مولانا صاحب آ گئے تو ہماری چائے ماری جائے گی کیا؟"

"نہیں بھیا۔ چائے تو آپ کے لیے بھی بنائی ہے۔ آپ کو بھی پلا دیں گے۔ ذرا اُدھر پار والوں سے برتن لینا تھے۔"

پولیس والے کے سایے میں چلتے ہوئے سوم ناتھ ایک ہی چھلانگ میں سڑک پار کر گیا اور رجب صاحب کے مکان تک گیا۔ اوپر جا کے اُس نے رجب صاحب کی بیوی کو سلام کیا۔ جواب میں اُس نے خیریت پوچھی۔ اور دونوں اپنے طور سے کرفیو کو کوسنے لگے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کا آپس میں ملنا جلنا بھی ختم ہو گیا ہے۔ سوم ناتھ پھر ایک بار یٹرہ دیدی سے اس بات پر ناراضگی کا اظہار کرتا رہا کہ آخر وہ لوگ گھر چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔ "ہمارے گھر آ کر رہتے تو ہم دیکھتے کوئی آپ کا کیا بگاڑ لیتا۔" پھر یٹرہ دیدی ایک بار کہنے لگی کہ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں۔ پہلے اللہ کا اور اس کے بعد آپ جیسے نیک ہمسایوں کا بھروسہ ہوتے کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ تو ہمارے لئے رشتہ داروں سے بڑھ کر ہیں لیکن وقت ہی خراب ہے۔ یہ دن رہنے والے نہیں۔ ہمسایہ تو ناک کا نال ہوتا ہے۔ رشتہ دار مہینے اور سال بعد ملا کرتے ہیں لیکن ہمسایہ روز ملا کرتا ہے۔ پھر بھی ہم پورا گھر ٹیکا لال کے حوالے کر گئے تھے۔ جلد ہی سوم ناتھ نے اپنا مطلب پھر یٹرہ دیدی کے آگے بیان کر دیا۔

"میرا ایک دوست پولیس افسر ہو گیا ہے۔ آج کل ہمارے علاقے ہی میں اس کی ڈیوٹی بھی لگی ہے۔ میں نے اُسے چائے پر بلایا ہے لیکن بد قسمتی سے ہمارے برتن کہیں رہ گئے ہیں اور ہاتھ نہیں آ رہے۔ اب آپ کے پاس دو چار پیالیاں لینے آیا ہوں۔" یہ سنتے ہی پھر یٹرہ دیدی بہو سے کہنے لگی۔ "تم ذرا سوم ناتھ کے لیے ٹی سیٹ نکال لاؤ۔" وہ سوم ناتھ سے بولی "ہمارے استعمال کی پرانی پیالیاں کہاں لے کر جاؤ گے۔ بے چارے سپاہیوں پر رحم کرنا چاہئے۔ ہم نے ٹیکا لال کو پچاس روپے دیئے اور ان دنوں اُس کا کھانا پینا بھی یہی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس بات سے غلام دین کے اس شبہہ کی تصدیق ہو گئی تھی کی رجب صاحب کے ساتھ ان کا تنظیمی رشتہ ضرور ہے۔ اور ٹیکا لال ان کے لئے امیرا کدل سے گوشت بھی لے آتا ہے۔ پھر یٹرہ دیدی کہہ رہی تھی۔

"اور یہ بے چارے پردیسی ہیں۔ جانے کن اطراف سے لائے گئے ہیں۔ یہاں لاچار اور مجبور ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمیں ان پر ترس آتا ہے۔ اگر یہ لوگ ہمارے ہاتھ کا بنایا ہوا کھانا

کھا لیتے، ہم ان کے لیے چائے اور چاول کبھی کبھی بھیج دیا کرتے۔" اتنے میں اُس کی بہو نیاٹی سیٹ لے کر آ گئی تھی اور سوم ناتھ کے آگے رکھ دیا تھا۔ پھر بیٹرہ دیدی سوم ناتھ سے بولی" جا کر انہیں چائے پلا دو۔ نیاٹی سیٹ ہے ابھی کسی نے بھی اس میں چائے نہیں پی۔ پیالیاں دیکھ کر سپاہیوں کا جی خوش ہو گا۔ ان کو ٹین کی ٹوٹی پھوٹی پیالیاں دی جاتی ہیں۔ جنہیں دیکھ کر میرا دل گھبرا جاتا ہے۔" سوم ناتھ چاہتا تھا کہ پھر بیٹرہ دیدی کی غلط فہمی دور کر کے اُس سے کہہ دے کہ "چائے غلام دین نے پینی ہے۔ باہر والے سپاہیوں نے نہیں لیکن اس سے خطرہ تھا کہ باتوں کا نیا دفتر کھل جاتا اور چونکہ وہ جلدی میں تھا۔ اس وجہ سے ٹی سیٹ سنبھال کر سلام کرتے ہوئے باہر آ گیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اُس نے سب سے پہلے چائے اندر بھجوادی اور تب جا کر کمرے میں آ گیا۔ نیاٹی سیٹ دیکھتے ہی لالہ کے ہوش اُڑ گئے۔ چائے سب کے لیے رکھ دی گئی تھی لیکن لالہ نے پینے سے انکار کر دیا۔ اپنی صفائی دیتے ہوئے غلام دین سے بولا" اس میں فرق ہی کون سا ہے جی! لیکن صرف اس وقت میری چائے سے رغبت نہیں۔ میں تقریباً روزانہ ایک نہ ایک مسلمان دوست کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی ہی لیتا ہوں۔ چند ہی دن ہوئے ہونگے ایک دوست کے یہاں دعوت میں گیا تھا۔ اُس کے یہاں بیٹی کی منگنی ہونی تھی اور بڑے زوروں کی دعوت تھی۔"

سوم ناتھ گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پی رہا تھا لیکن ہر گھونٹ کے ساتھ لگ رہا تھا کہ لالہ کی باتوں کی کڑواہٹ گھول رہی ہے اور اُسے زبردستی حلق سے اتارنا پڑ رہی ہے۔ یہی کیا کم تھا کہ لالہ اتنی دیر سے دونوں کو پوری سنجیدگی کے ساتھ محو گفتگو پایا، تو اس کی جان میں جان آئی۔

کرفیو کے دوران لالہ روشن دان کی دراڑوں سے جھانک جھانک کر مدھیہ پردیش پولیس کا تماشہ دیکھا کرتا تھا اور اس پر سوم ناتھ کو بڑی کوفت ہوتی تھی۔ وہ باپ کی موجودگی میں نہ تو پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی اونگھ سکتا تھا کیونکہ لالہ کی کومینٹری بس چالو ہی رہا کرتی تھی۔ وہ ان کے سامنے سگریٹ بھی نہیں پی سکتا تھا۔

"آج بڑی سختی ہو رہی ہے۔ بغیر پاس کسی کو بھی آنے جانے کی اجازت نہیں۔ وہ دیکھو۔ کوئی بے چارہ دھر لیا گیا ہے۔ جانے کس کام سے ادھر والی گلی سے ابھی نکل آیا تھا۔

اپنے طور سے تو یہ نہ جانے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اپنے پاجامے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ بتانا چاہ رہا ہے۔ لیکن یہ کہاں مانے گا۔ یہ تو مدھیہ پردیش کی پولیس ہے، یقینی طور سے قابل ترین پولیس ہے یہ۔ یہاں یہی کامیاب بھی رہے گی۔۔۔ وہ دیکھو سپاہی اس پر ڈنڈے برسا رہا ہے۔۔ ہاں مارو۔ اور مارو۔ یہ لوگ باز آنے والے نہیں۔ کرفیو، کے اُٹھتے ہی یہی لوگ پولیس پر بھی پتھر ماریں گے اور مکانوں پر بھی۔۔۔ اور وہاں۔۔۔ ادھر اس طرف پولیس نے کسی پگڑی والے کو روک رکھا ہے۔۔۔ ہانہہ۔ یہ تو وہی ہے۔ ہاں وہی ہے بالکل۔ کنہ جو۔ لیکن یہ اس طرف کہاں؟ بھلا پوچھو یہ جائے گا کدھر، کس کے گھر جا کے رہے گا؟۔۔۔ اے ناتھا۔ سر اندر کر لے اپنا۔ خبردار کھڑکی سے ہرگز نہ جھانکنا۔ اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ بے شرم بن کے یہیں در آئے گا۔۔ جانے وہ سپاہی اس کو کیا سمجھا رہا ہے۔ کنہ جو اسے اپنے جنیو دکھا رہا ہے یا شاید کرفیو پاس ہے۔۔۔ لیکن کرفیو پاس اس کے پاس کہاں؟ یہ جنیو ہی ہوگا۔ چھوڑ دیا ہے اے ناتھا خبردار رہنا۔" ایسے موقعوں پر سوم ناتھ تلملا کر رہ جاتا تھا اور کمینٹری کرتے ہوئے اپنے باپ کو وہیں صندوق پر کھڑے چھوڑ کر نچلی منزل میں آجاتا تھا۔ اور یہی لالہ اب اس وقت کہہ رہا تھا آخر فرق ہی کیا ہے۔ فرق جو بھی ہے سوم ناتھ اس سے پوری طرح واقف تھا۔ غلام دین بھی خاموش ہو کر چائے پی رہا تھا اور اس کے دونوں ماتحت روٹیوں پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ آخر جب خاموشی کچھ زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ سوم ناتھ سکوت توڑنے کی غرض سے بولا۔

"میں آپ سے مخاطب ہوں غلام دین۔ نہ معلوم ابھی کتنے دنوں تک یہ کرفیو رہنا ہے۔ لیکن ہم سختیاں جھیلنے پر مجبور ہیں۔ کیا کریں۔ مکان ہی ایسی جگہ پر واقع ہے۔ گھر کے اندر کئی طرح کی ضروریات ہوتی ہیں۔ میں دیکھتا رہتا ہوں کہ اور لوگ امیرا کدل سے گٹھریوں کے حساب سے سودا سلف لاتے رہتے ہیں۔"

غلام دین کو اس بات پر قدرے غرور آگیا لیکن زبان سے اس کا اظہار کئے بغیر سوم ناتھ سے کہنے لگا۔

"کیوں۔ آپ کے یہاں کرفیو پاس نہیں ہے؟"

"کہاں کا کرفیو پاس۔ کوئی بھی افسر ہمارا دوست یا رشتہ دار نہیں ہے کہ جس کی وساطت سے ہم کرفیو پاس ہی حاصل کر لیتے۔"

"تو۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ اے ٹیکا لال۔" غلام دین اپنے ماتحت سے بول اُٹھا۔

"کل، ماسٹر جی کے لیے کرفیو پاس بنوا کے لے آنا۔ لیکن ماسٹر جی۔ کرفیو پاس کا آپ کریں گے بھی کیا؟ شام کو ہماری اعلان گاڑی امیرا کدل جائے گی ہی۔ آپ بھی اُسی میں بیٹھ کر ہو آیئے گا۔ اور جس قدر چاہئے سودا سلف لیتے آیئے۔"

اس پر لالہ بہت خوش ہوا۔ خوشی اس کی آنکھوں سے مترشح تھی۔ وہ بولا "دیکھا ناتھ جی۔ میں نہ کہتا تھا کہ بھگوان نے اپنے اور پرائے میں واضح فرق پیدا کیا ہے۔ غلام دین صاحب کی صرف ایک رات پہلے ہی یہاں ڈیوٹی لگی ہے ابھی دیکھنا کہ آگے کیا کیا مدد ملے گی ہمیں۔ اور ایک وہ ہیں پنجاب پولیس والے۔ ان کو ذرا بھی رحم نہیں آتا۔"

سوم ناتھ کو لگا کہ چائے میں پھر ایک بار کڑواہٹ گھول رہی ہے۔ چنانچہ حلق سے اتارنے کی بجائے اُس نے چائے کا گھونٹ کھڑکی سے باہر اُگل دیا۔ غلام دین بولا۔

"چھوڑیئے پنڈت جی۔ یہ لوگ بہت جلدی واپس بارکوں میں چلے جائیں گے۔ انہوں نے یہاں گند پھیلا رکھی ہے۔" وہ بڑی ہی وثوق سے کہہ رہے تھے۔ "ہم نے کئی بار ان کو لوگوں سے بھات لیتے دیکھا ہے۔ چائے مانگتے سُنا ہے۔ ٹھیک ہے ہم جانتے ہیں کہ ان کو کھانے کے نام پر کیا ملتا ہے۔ دو پھلکے روٹی اور دال کا ایک کٹورا۔ بہت ہلکی چائے اور ایک ژوچہ دَرُو۔ لیکن جہاں تک لوگوں سے بھیک مانگنے کا سوال ہے۔

خیر سے یہ بھی تو بھیک ہی ہے، اس سے ہمارے سپاہیوں کو شہہ ملنے کا احتمال ہے۔ اور ڈسپلن خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔"

اچانک سوم ناتھ نے چائے کی پیالی نیچے رکھ دی۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس نے آوازیں سُن لیں جو باہر آنگن سے آ رہی تھی۔ وہ جان گیا کہ حسبِ معمول آج بھی مدھیہ پردیش کے پولیس والے آئے ہونگے اور ماں انہیں چائے پلا رہی ہو گی۔ باتوں کے اسی شور میں اُس نے ایک آواز صاف پہچان لی۔ یہ کیپٹن شیاما چرن کی آواز تھی جو اس کی ماں سے کہہ رہا تھا۔

"پنڈت جی کہاں ہیں ماتا جی؟ خوب گرم گرم کلچہ لایا ہوں ابھی۔ ذرا ہم بھی لیتے سواد کشمیری کلچے کا۔ چائے کالی پلایئے گا؟"

سوم ناتھ کسی کام کا بہانہ بنا کر کمرے سے ہی نکل آیا۔

رسول پونپر

مُغالطہ

زوروں کی بارش ہورہی تھی۔ گاڑی بریک لگتے ہی ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی تھی۔ سواریاں منہ کے بل آگری تھیں۔ مشین، آخر مشین ہے، اس وجہ سے ایک دم رُک گئی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ لیکن اب تک میں اطمینان کا سانس لے کر خدا کا شکر بجالارہا تھا کہ خیر سے جان بچی ہے۔ اب تک تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا البتہ دفتر پہنچنے میں دیر ہورہی تھی۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے بس کے باہر نظر اُٹھائی اور دیکھا کہ میری بس کے آگے ایک اور مرسڈیز بس کھڑی تھی۔

ہونہ ہو اس گاڑی کا بھی ٹایر پنکچر ہو گیا ہو۔ میں نے خیال کیا۔ دم سادھے اور سانس روکے میں اپنی بس سے اتر آیا اور پھلانگتا ہوا اگلی بس کی جانب دوڑ گیا۔ مرضی مولا کی تھی کہ اس بس کی بہت ساری نشستیں خالی تھیں۔

دو سواریوں والی سیٹ پر وہ اکیلی بیٹھی تھی۔ شاید میرا، یا شاید کسی اور کا انتظار کررہی تھی۔ میری شکل دیکھتے ہی وہ جھٹ سے ایک طرف سرکنے لگی۔

"آیئے بیٹھیے۔"

الفاظ سنتے ہی میری باچھیں کھِلنے لگیں۔ اس قدر اپنائیت بھرا لہجہ۔ "آیئے بیٹھیے، میں ماضی کی یادوں میں کھو کر رہ گیا تھا اور بے خیالی میں اُسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ بس پھر ایک بار اسٹارٹ ہونے لگی تھی۔ اس کے سڈول اور خوب صورت جسم کے چھوتے ہی میرے اندر آگ کا طوفان مچل اٹھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ جیسے میرے پہلو میں ننگی لیٹی ہے۔

اُس نے نایلون کا فراق اور شلوار پہن رکھا تھا۔ اُس کے کالے شبھار جیسے لمبے لمبے بال تھے اور ریشم جیسی ملائم جلد۔ اس پر بھری بھری چھاتیاں جن کو دیکھ دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔ میرا سانس یوں پھول رہا تھا کہ جیسے میں بدقت تمام شنکر آچاریہ

کی پہاڑی چڑھ کر آیا ہوں۔ وہ بھی بلاوجہ۔

وہ مجھے کَنداَنکھیوں سے جیسے ٹٹول رہی تھی۔ میں چُپ تھا اور یہ نہیں جان پارہا تھا کہ بات کیسے شروع کروں۔ اور کیسے برف کی طرح سرد اس خاموشی کو پگھلا کر توڑ دوں۔ وہ میری اُور بار بار دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔

"اے پُغد۔ کچھ تو بول دے۔ اپنا دل کھول دے۔" شاید اُسے میری کوئی بیوقوفی یاد آرہی تھی اور اب سوچ رہی تھی کہ "عقل تو آئی ہے، لیکن بہت دیر بعد۔ جو کام اس کے قریب رہ کر نہ ہوسکا، بھلا اب وہ اتنی دور رہ کر کیا ہوگا۔"

میری دُنیا اب تک بس کے اسی ٹوسیٹر میں سما کر رہ گئی تھی۔ درخت، پودے، مہادیو پہاڑ، دور دور تک پھیلا ہوا ڈل کا صاف و شفاف آئینہ۔ سارا منظر میری آنکھوں کے اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی مجھ سے دور تھا۔ فطرت اپنا عکس ڈل کے نیلگوں پانیوں میں دیکھ رہی تھی اور میں اپنے ٹوٹے دل کی کرچیاں سنبھالے چیخ رہا تھا۔

"یہ یہاں۔ اس جگہ ٹیس اُٹھ رہی ہے۔ درد ہورہا ہے۔"

بس کالج کے گیٹ پر آکر رُک گئی تھی۔ ہم دونوں بس سے نیچے اُتر آئے تھے۔ وہ آگے آگے جارہی تھی اور میں پیچھے پیچھے۔ سڑک کے اُس پار جاتے ہوئے وہ ایک دم مڑی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

"بولو۔ کب آنا ہے وہاں؟"

"اب کیا لینا ہے وہاں آکر؟"

"کچھ نہیں۔ بس یونہی۔"

"اچھا۔"

میں اس کی چال دیکھتا رہ گیا، جب تک وہ سڑک پار چلی گئی۔ بارش زوروں کی ہورہی تھی۔ میری آنکھوں کی امرت دھارا اس کے حق میں دعا گو تھی۔۔۔ وہ نہ ہوتی تو اس کا وجود بھی کہاں ہوتا؟

سوم ناتھ زتشی

جب پَو پھٹی

دو دن سے متواتر برف گر رہی تھی اور ابھی تک تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کُھلے آسمان کی طرف دیکھ کر لگتا تھا کہ فضا میں لاکھوں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے اور کالے کالے کیڑے چاروں اُور تیر رہے ہیں اور تیر کر نیچے گر رہے ہیں۔ لیکن مکانوں کے پس منظر میں دیکھ کر یہ کیڑے روئی کے گالے سے لگ رہے تھے۔ یوں جیسے کوئی دُھنیا زور زور سے روئی دھنک رہا ہے یا جیسے شگوفوں سے لدے ناشپاتی کے اَن گنت پیڑ ایک ہی جگہ جمع ہو کر اپنی ٹہنیوں سے سارے پھول ایک ساتھ جھٹک رہے ہوں۔ کل بھی دن بھر برف گری تھی لیکن وہ اس قدر بھاری نہ تھی کہ جس قدر آج کی برف لگ رہی تھی۔ یہ اس قدر گھنی تھی کہ بیس گز دور تک نظر جانی مشکل تھی۔ ہر طرف دھند تھی اور دن ڈھلنے کو تھا۔

دن بھر کا کام ختم کر کے رسول گھر جا رہا تھا۔ اُس نے اپنا جسم چادر سے لپیٹ رکھا تھا جو اب گیلی ہو چکی تھی۔ چونکہ جلدی میں تھا۔ اس لئے تیز تیز قدم اُٹھاتا جا رہا تھا۔ جلدی ہونے کی وجہ سے اُس نے آج معمول سے پہلے ہی اپنا کام مکمل کر دیا تھا۔ ویسے برف باری کی بنا ہر لالہ جی کے یہاں آج زیادہ کام بھی نہ تھا۔ کیونکہ گھٹا کُھل جانے کی وجہ سے وہ برف میں خراب بھی ہو سکتے تھے۔ ایک اور بات یہ تھی کہ لالہ جی شام ہی سے کل منائی جا رہی یومِ آزادی کی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔ آج سویرے ہی رسول کو کرالہ کھڈ سے چراغ لانے کے لیے بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد دُھنیے کے یہاں باتی بنانے کے لیے روئی۔ اس کے بعد چراغوں کے لیے تیل اور حلوہ اور مٹھائی والے کے یہاں ایڈوانس چھوڑنے اور دودھ والے کے یہاں یہ پیغام لے کر کہ کل کے دن کی خاطر پوری طرح کی سامگری تیار کر کے رکھنا ہے اور صبح سویرے ہی لے کر آنا ہے۔ کام ختم کر کے رسول واپس آگیا اور اس کو دیکھ کر بول اُٹھا۔

"کیوں۔ سارے کام ہو گئے؟" لالہ جی کئی برس سے کشمیر میں کپڑے کا بیوپار کرتے

تھے۔ اصل میں اُمر تسر سے آئے تھے لیکن اب کشمیری بھی سیکھ لی تھی۔

"ساری چیزیں آگئیں ؟"

"ہاں مہاراج سب کچھ لے آیا ہوں۔" وہ لالہ کے نزدیک گیا اور بولا "یہ چلم ادھر کردو لالہ۔" لیکن لالہ کو کسی اور کام میں مشغول دیکھ کر رسول نے خود ہی جاکر حقے سے چلم اتار لیا۔ دو چار کش لگا کر واپس حقے پر رکھ لیا اور لالہ سے کہنے لگا۔

"لالہ پاؤں شل ہو چکے ہیں۔ بیمار بیٹا ہے گھر میں۔ آج مجھے تھوڑی سی فرصت دے دیں۔" لیکن لالہ کسی کام میں منہمک تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لگتا تھا مرغی چور کو کوس رہا ہے۔ رسول لالہ کو دیکھ رہا تھا جو اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔ رسول کی آج کی یہ نظریں وہ نظریں ہر گز نہ تھیں جو چند سال پہلے تک ہوا کرتی تھیں۔ آج ان کی نظروں میں شکوک تھے اور کدورت تھی۔ پہلے تو اس کی نظریں لالہ کی نظروں کے آگے ٹک نہیں سکتی تھیں۔ وہ نہ تو لالہ کی پوشاک دیکھتی تھیں اور نہ ہی اس کے کاندھوں پر پڑی شال۔ وہ لالہ کا حقہ، تکیہ، پلنگ کی چادر، کچھ بھی تو نہیں دیکھتی تھیں۔ لیکن آج کی ان نظروں نے سبھی کچھ جان لیا تھا اور سمجھ لیا تھا۔ رسول کی سمجھ میں اب ہر بات آرہی تھی۔ ہر چیز چاہے اُتھلی تھی یا گہری، سیاہ تھی یا سفید۔ اور لالہ کو اس بات کا بھی پتہ لگ گیا تھا کہ کوئی رسول کو پٹی پڑھا رہا ہے۔ لالہ سے بد ظن کرنے پر تُلا ہوا ہے۔

برف گر رہی تھی اور لالہ حساب جوڑ رہا تھا۔ رسول ایک نظر اپنے پاؤں کو گھور رہا تھا جن میں دو پیسے کا پلہ ہو رہا تھا۔ جن کا گوشت برف کی ٹھنڈک سے اس قدر سُرخ ہو چکا تھا کہ اس سے گرم گرم بھاپ نکل رہی تھی، اور ایک نظر وہ لالہ کو دیکھ رہا تھا جو اس سے لاتعلق ہو کر بس اپنے میں مگن تھا۔ اُس نے قدرے اونچی آواز میں پھر ایک بار کہہ دیا۔

"کیوں لالہ۔ ملے گی فرصت؟" اس پر لالہ نے گردن گھما کر اُسے دیکھا اور بولا

"کیا بولے تم۔ فرصت۔ ہاں۔ ابھی تم جاؤ۔ لیکن کل ذرا جلدی آجانا۔"

"آؤں گا لالہ۔ اگر میرا بیٹا ٹھیک ہوا تو۔"

"اُسے گرم پانی پلاتے رہو۔ بخار اُتر جائے گا۔" اور یوں سلام دُعا کے بعد رسول وہاں سے چل دیا۔ لالہ نے ایک روز پہلے ہی اُسے یہ بات سمجھا دی تھی کہ کل کے دن کی اہمیت کیا ہے۔ یہ دن کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ رسول سوچ رہا تھا کہ کل پورے ہندوستان کو آزادی

مل جائے گی ۔ وہ جمہوریہ ہند کہلائے گا۔ اگر یہ سچ ہے تو حمد کاک، جمال ڈار اور قادر شیخ جیسے دوستوں نے یہ بات اب تک چھپائی کیوں۔ اُسے بتائی کیوں نہیں۔ انہوں نے اپنی باتوں کے دوران اس بات کاذکر کیوں نہیں کیا۔ حالانکہ وہ ہر شام ملا کرتے تھے اور آپس میں کارخانوں کے جھگڑے، مشکلات اور مزدوروں کے مسائل جیسے ہر طرح کے موضوع پر کھل کر بات کرتے تھے۔ لیکن یہ آزادی والی بات ؟اب جا کے لالہ ہی نے اُسے اس بارے میں بہت کچھ سمجھادیا تھا۔

یوں چلتے چلتے امیر اکدل بھی آگیا۔ پُل پر ساری فوجی گاڑیاں گذر رہی تھیں۔ تانگے والے گھوڑوں کی لگامیں تھام کر انہیں ایک ایک قدم چلا رہے تھے۔ بہت سارے مزدور سڑک پر سے برف ہٹانے میں مصروف تھے۔ وجہ یہ تھی کہ پُل پر برف کی وجہ سے سخت پھسلن تھی اور دوسرے کل اسی سڑک پر سے فوجیوں کا جلوس گذرنے والا تھا۔ آج یہاں کے فٹ پاتھوں پر کسی بھی بھکاری کو بیٹھنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ سب بھگادیے گئے تھے۔ پہلے ہی ان فٹ پاتھوں پر بہت سارے بھیکاری ہوا کرتے تھے لیکن اب کم ہونے لگے تھے۔ ان میں اکثر گریز اور تلیل سے آئے ہوئے بھکاری تھے جو قبائلی حملے کے خوف سے اپنا گھر چھوڑ کر آگئے تھے۔ اب یہاں بس ایک لڑکی رہ گئی تھی۔ پُل پار کرتے ہی رسول نے اس لڑکی کو ایک دکان کے چھجے تلے دیکھا۔ اس نے اپنا دامن پھیلا کے رکھ دیا تھا۔ اس کے نزدیک ہی ایک چھاپڑی فروش تھا۔ لڑکی کے کان میں بھی شاید کہیں سے کل کے بارے میں بات گئی تھی کہ کل سبھی آزاد ہو جائیں گے۔ اس سڑک پر سے کل جلوس گذرنے والا ہے۔ چنانچہ رسول جو پہلی چھاپڑی فروش کے آگے رُک گیا، لڑکی یوں چلائی۔

"نبی کریم تم کو بھی آزاد کردے گا اور تمہارے بال بچوں کو بھی۔ خدا کے لیے ایک پیسہ دے دو۔" رسول اس لڑکی کی طرف ابھی دیکھ ہی رہا تھا کہ بائیں طرف سے ایک فوجی ٹرک برف کا سینا چیرتا ہوا گذر گیا۔ اور سڑک پر پھیلا ہوا لڑکی کا دامن اُس برف سے بھر دیا جو ویل گھومنے کی وجہ سے سڑک سے اُچھل کر لڑکی کے کپڑوں پر آگرا تھا۔ رسول نے لڑکی کی یہ دُرگت دیکھ لی اور تلملا اُٹھا۔ لیکن اچانک اُسے گھر کی یاد آئی اور چادر اپنے گرد لپیٹ کر تیز تیز چلنے لگا۔ بیوی نے جلدی لوٹنے کو کہا تھا۔ لیکن یہاں تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ چلتے چلتے وہ سوچ رہا تھا۔ کہ نہ جانے اب کے اُس کے بیٹے کا کیا حال ہوگا۔ بیوپاری کے یہاں ملازم ہونا بھی ایک لعنت ہے۔ دن بھر کی محنت کر کے بھی یہاں کیا اُجرت ملتی ہے۔ آج چونکہ برف ہے اسی وجہ سے

تھوڑی فرصت مل گئی ہے۔ نہیں تو لالہ اس قدر جلدی چھوڑنے والا کہاں۔ اور جو اس نے بچے کی خاطر شنگرف، گاؤزبان جیسی بوٹیاں دی ہیں جو گاؤں کے بزرگ وہاب صاحب نے تجویز کی تھیں۔ اس کے گاؤں میں دور دور تک کوئی حکیم نہ تھا۔ بخار سے تپتے بیٹے کو کہاں کہاں لئے پھرتا۔ ڈاکٹر کے یہاں گیا تھا تو اس نے بچہ ساتھ لے آنے کا تقاضہ کیا۔ اور وہ بھی کل کے بعد دوسرے دن کیونکہ کل آزادی کا دن تھا۔ رسول نے کل ہی دیکھنے کے لیے کہہ دیا تو ڈاکٹر بگڑ کر بولا کہ ہر شخص کل کو آزادی کی خوشیاں سمیٹنے جارہا ہے کیا اس روز بھی مجھے بیماروں کو دیکھنے کی مصیبت سے چھٹکارا نہیں دو گے۔

اور جوں جوں گھر نزدیک آتا گیا۔ رسول کی طبیعت اور بھی گھبرانے لگی۔ جس شخص کی قسمت میں سوائے غریبی اور پریشانی کے کچھ نہ ہو، وہ تو گھر میں داخل ہوتے ہی گھبرا کر رہ جاتا ہے۔ گھر میں داخل ہونا ہی نہیں چاہتا۔ اندر جاتے ہی بیوی کا تقاضہ ہوگا کہ "لے آئے کچھ؟" سردی اور بھوک کے مارے بچے بس روتے ہوئے آگے اور ٹانگوں سے لپٹے رہیں گے۔ ان میں کچھ بھوکے اور ننگے ہوں گے اور کچھ بیمار۔ رسول پھر بھی ان چیزوں کی خاطر بڑے دل گُردے والا آدمی واقع ہوا تھا۔ پریشان تو تھا لیکن ہمت والا تھا۔ گھر تلک آتے ہی اُس کو سب کچھ یاد آگیا...... دن ڈھل چکا تھا۔ پرندے آج صبح سے ہی گھونسلوں میں دُبک کر رہ گئے تھے کیونکہ برف باری کی بنا پر وہ اُڑ نہیں سکے تھے۔ اور آج ان کی چہچہاہٹ بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔

دروازے کے اندر آتے ہی اس نے چادر پر سے برف جھاڑ دی۔ یہ اس قدر گیلی ہوگئی تھی کہ نچوڑی جاسکتی تھی۔ چھت کی بنا پر اُس پر برف نہیں گر رہی تھی۔ اس وجہ سے اُسے اطمینان تھا۔ لیکن اپنے دو منزلہ حجرے کی باہری سیڑھی کو پھلانگتے دیکھا کہ چھت ٹپک رہی تھی۔ برف کے پگھلتے ہی ہر طرف پانی پانی ہو جاتا تھا۔

کمرے کے ایک کونے میں بیمار لڑکا پڑا تھا۔ اس پر ایک ہی چادر پڑی تھی۔ بیوی اُس کے پہلو میں لیٹی پڑی تھی اور فکروں میں غلطاں دکھائی دے رہی تھی۔ چراغ دان میں چراغ کا تیل خشک ہو رہا تھا اور وہ بھی بجھ رہا تھا۔ بیوی نے شوہر کو دیکھا اور اس کے چہرے پر رونق سی آگئی۔ اُس کی ڈھارس بندھ گئی تھی۔

"کیا حال رہا اس کا۔ آج دن بھر؟" رسول نے بیوی سے سوال کیا......

"حال۔ بس ویسا ہی ہے جو صبح کو تھا۔" بی بی نے کہہ دیا۔

"شربت پی لی ہے اس نے۔"

"بس ایک دو گھونٹ وہ بھی میری زبردستی سے۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ بیمار لڑکے کو کھانسی آ گئی۔ وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔

"ہائے بابا۔"

"میرے بیٹے۔ کیا حال ہے اب۔"

رسول نے بڑی شفقت سے اس کے سینے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ دیکھا تو دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بالکل مرنے والے سے انداز میں۔ بُخار تیز تھا۔ سانس پھولنے لگا تھا۔ بیوی کبھی بچے اور کبھی خاوند کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

"بچہ ہے۔ بیمار تو ہوتا ہی رہتا۔ اس میں گھبرانے کی کون سی بات ہے۔" رسول نے بیوی کی ڈھارس بندھانی چاہی۔

"اتنے دنوں سے جو بخار میں تپ رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے۔۔۔" بیوی روتے ہوئے بولی......

کمرے کے تیسرے کونے میں آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ چراغ کی لو بھڑک اٹھی تھی۔ رسول نے جا کر بتی ٹھیک کر دی اور واپس اپنی جگہ پر آ کر بیوی سے کہہ دیا

"حمد کاک تو نہیں آیا تھا؟"

"ہاں آیا تھا۔ اس کے علاوہ جمال کاک اور قادر شیخ بھی آیا تھا۔"

"کیا کہہ گئے؟"

"کہہ رہے تھے کہ رسول نے سلطان کی بیماری سے متعلق ذکر تک نہ کیا۔ اس کے بعد وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے کہہ گئے کہ کل ڈاکٹر کو لے آئیں گے۔ وہ تو آج بھی گئے تھے لیکن ڈاکٹر نہ ملا تھا۔ نو بج چکے تھے اور برف گر رہی تھی۔

"بابا۔ اُٹھ کر اسے ایک گھونٹ شربت پلا دو۔" بیوی یہ کہتے ہوئے اُٹھی "اُٹھ میری جان۔ اُٹھ تیرا تو یہی مقدر ہے۔ سارے جہاں کے لیے تو آزادی آ گئی ہے لیکن میرے گھر میں ابھی بھی تنگدستی اور افلاس کا راج ہے۔ واہ رے تیری خدائی۔"

"بیوی!۔ ایسا نہیں کہتے۔ بھلا اس میں خدا کا کیا قصور؟"

بیوی نے اصرار کے بعد بچے کو شربت پلا دی۔ اس کے بعد خود بھی چند ایک لقمے

کھائے اور شوہر کے اوپر میلی کچیلی لحاف ڈال کر خود بھی سلطان کے بغل میں لیٹ گئی۔

رسول نے لیٹ کر لحاف کے اندر کانگڑی رکھ لی۔ چونکہ بدن سرد تھا اس وجہ سے نیند بھی دیر تک نہ آسکی۔ کروٹ بدلنے پر اُس کی نظریں چراغ کی طرف گئیں۔ جواب بجھنے والا تھا۔ چراغ کو دیکھ کر وہ خوفزدہ ہونے لگا تھا۔ اس کی پریشانیاں بڑھ رہی تھیں اور بہت کچھ یاد آرہا تھا۔ کل آزادی کا دن تھا۔ اور یہاں یہ پریشانیاں تھیں۔ جس روز بیٹا بیمار ہوا تھا۔ بس اسی دن بیوی سے جھگڑ بیٹھا تھا۔ اور اب تک اسی بات کا دکھ تھا۔ آخر اُس کا قصور کیا تھا۔ اُس نے تو جان بوجھ کر اُسے بیمار نہیں کردیا تھا۔ بچہ گر گیا تھا۔ کیچڑ میں لت پت تھا۔ بیوی نے اُس کے کپڑے اتار دئے۔ گھر میں اور کوئی جوڑا بچے کو پہننے کے لیے نہ تھا۔ چنانچہ گھنٹہ بھر تک اُسے بغیر کپڑوں کے رہنے دیا گیا تھا۔ جس پر وہ بیمار ہو گیا تھا۔

چنانچہ ان باتوں کو یاد کرتے ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو آنے لگے تھے۔ اُسے لالہ پر بھی غصہ آرہا تھا جو آزادی سے متعلق جانے کیا کیا بک گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اُس کی سیٹھانیوں کی بھی یہی حالت ہوتی۔ اُس کے بچے بھی کیچڑ میں لت پت ہو کر بیمار پڑ جاتے تو کیا ہوتا؟ لیکن وہ کہاں گرنے والے تھے۔ ان کے پاس تو موٹر تھی۔ یہ ہم جیسے لوگ ہی ہیں جو گرتے اور پھسلتے ہیں۔ ہم زخمی ہو جاتے ہیں پھر بھی برداشت کرتے ہیں۔ گر جاتے ہیں لیکن پھر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لالہ اگر ایک بار گر جائے تو دوبارہ اُٹھنے کا نام نہ لے۔ پرسوں ہی کی بات ہے۔ مجھ پر غصہ ہونے لگا تھا لیکن جلد ہی ٹھنڈا بھی پڑ گیا تھا اور مجھ سے بڑے ہی اخلاق سے باتیں کرنے لگا تھا۔۔۔ اور کب تک ان کی یہ چالاکیاں چلتی رہیں گی۔ پانچ روپے اس سے بطور ایڈوانس مانگ لئے تھے۔ کہا تھا کہ بچہ بیمار ہے۔ اس پر انکار کر دیا تھا جیسے اُس کی جان ہی نکل گئی تھی۔ ان کی جان نکلنا بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ حساب میں ایک آدھے پیسے کا ہیر پھیر دیکھتے ہی ان کا چہرہ پیلا پڑ جاتا ہے۔ حالانکہ کمی کسی چیز کی نہیں ہے۔ ایک دو کارخانے ہیں جن کی خواجہ سلطان کے ساتھ شراکت چل رہی ہے۔ کمیشن اجنٹی بھی کرتا ہے۔ پانچ گاڑیوں کا مالک ہے جن میں امرتسر سے مال لے آتا ہے۔ یہ مال وہاں سے اُس کا بھائی روانہ کرتا ہے۔

چراغ اب بجھ رہا تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ باہر کتے کے بھونکنے سے بھی اندر کمرے میں ارتعاش سا پیدا ہوتا تھا۔ اچانک بیوی کی آنکھ کھل گئی۔

”رسول۔ تم جاگے ہو۔“ بیوی سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"کیوں کیا بات ہے؟" رسول بول اُٹھا۔

'مجھے ڈر لگا ہے۔ میں نے خواب دیکھا ہے۔"

"کوئی نہیں۔ سو جاؤ۔ آرام کرو۔ ذرا دیکھ لو سلطان کا بخار اتر گیا ہو گا۔"

اُس نے بچے کا بخار دیکھنے کی خاطر جونہی بازو اٹھایا تو کانچ کی چوڑیاں زور سے بج اُٹھیں۔ وہ بولی "بخار تو اب بھی ہے۔ لیکن قدرے کم ہے۔۔۔ میں نے ایک خوفناک خواب دیکھا ہے۔"

رسول اس پر مسکرا دیا۔ لیکن بیوی قسم کھا کر بولی "خدا کی قسم ڈر لگ رہا ہے مجھے۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ کل دلی میں جلوس نکلے گا۔ بس وہی خواب میں دیکھ رہی تھی کہ جیسے ایک بڑا جلوس جا رہا ہو۔ اس میں بہت سارے لوگ تھے۔ بہت ساری عورتیں سینہ کوبی کئے جا رہی تھیں۔ میں نے کسی سے پوچھا کہ تم کیوں رو رہی ہو۔ بولی ہمارے بچے کھو گئے ہیں اور ہاتھ نہیں آ رہے۔ ڈر ہے کہ اس جشن میں کہیں روندے نہ جائیں۔ آپ دیکھ رہی ہیں۔ یہاں بڑے بوڑھے بھی روندے جاتے ہیں۔۔۔ پس میں بولی کہ میرا بچہ بیمار ہے۔ ہمارے یہاں جب مہاراج کا جنم دن آتا تھا، دریائی جلوس نکلتا تھا۔ میرا بیٹا کشتی میں بیٹھ کر جلوس کا تماشہ دیکھنے جایا کرتا تھا۔ موٹر لانچ جب دوڑتے تھے تو اس کی لہروں سے ساری کشتیاں ڈولنے لگتی تھیں۔ کئی شکارے ڈوب جاتے تھے۔ اور میں یہ دیکھ کر روتی تھی۔" بیوی نے خواب بیان کر دیا تو رسول بولا۔

"تمہیں نہیں معلوم۔ وہاں تو لوگ جلوس میں روندے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں ابھی تک وہی لہروں کا انداز ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم لوگ ان لہروں میں ڈوب کر رہ جاتے ہیں لیکن لالہ اور اس جیسے لوگوں کے لیے یہ لہریں دولت کے انبار لے کر آتی ہیں۔

رسول کو پھر ایک بار لالہ کی یاد آئی۔ اُس نے آزادی کے بارے میں بہت کچھ کہا تھا۔ رسول کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ کروٹیں بدل رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ اچانک اُس کے ذہن میں ایک خیال آ گیا۔ اور دم میں ٹھان لی کہ اگر لالہ کی بات سچ ثابت ہوئی تو میری خواہش بھی پوری ہو کر رہے گی۔

رات بھر وہ کروٹیں بدلتا رہ گیا تھا۔ بیوی بھی صبح کو وقت سے پہلے ہی جاگ اُٹھی۔ دیکھا تو بچے کی حالت بہت حد تک دُرست تھی۔ بُخار کم تھا۔ سانس بھی معمول پر تھا اور کھانسی

بھی بہت حد تک ختم ہو گئی تھی۔

"کیا حال ہے بچے کا؟ کل سے کچھ فرق ہے؟"

"خدا کے فضل سے کل کے مقابلے میں آج ٹھیک لگ رہا ہے۔ خدا کرے اس تکلیف سے اسے چھٹکارا مل جائے۔" وہ اُٹھی اور بچوں کے اوپر اپنا بستر ڈال کر خاوند کے لیے قہوہ بنانے لگی۔ رسول نے کھڑکی کھول دی اور دیکھا کہ برف اب بھی لگاتار گر رہی تھی۔ تقریباً پانچ گرہ جمع ہو گئی تھی۔ روشنی ہونے کے باوجود لگ رہا تھا کہ ابھی رات باقی ہے۔ پر آج کی برف اُسے آسمان سے اُڑتے کیڑوں کی بجائے خوفناک ٹڈیاں لگ رہی تھیں جو سب کچھ ختم کرنے پر تل گئی تھیں۔

سوچا کہ پھول تو لالہ جی کے لون میں گر رہے ہوں گے۔

کل ہی کی طرح آج بھی چاروں طرف دھند پھیلی ہوئی تھی۔ نظر دور تک جاتی ہی نہ تھی۔ نہ دائیں نہ بائیں۔ نہ آگے نہ پیچھے۔ اُس نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ انسانیت کہاں ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ سڑکوں اور گلیوں میں ٹوٹے بجلی کے تار جو ابھی تک اُسے رسیاں لگ رہے تھے، اب لوہے کی زنجیروں میں بدل گئی تھیں۔ اور جن میں وہ اس کے بیوی بچے بری طرح جکڑ لئے گئے تھے۔ اُسے لگا کہ زندگی ہی منجمد ہو کر رہ گئی ہے۔ رسول جھلا گیا اور ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بی بی۔۔۔" اُس نے بیوی کو پکارا۔

"کیا بات ہے۔" بیوی دوڑتی آ گئی "کہاں جا رہے ہو؟"

"میں امیرا کدل جا رہا ہوں۔ واپسی پر آ کر قہوہ پیوں گا۔" وہ بولا۔

"نہیں تو۔ حمہ کاک اور قادر شیخ تو بس آ ہی رہے ہونگے۔ ڈاکٹر کہاں رُکے گا تب تک۔"

"میں ان کو بھی اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں۔ ان کے بغیر میرا کام نہ ہو گا۔ اس کے بعد ہی ڈاکٹر کو دیکھ لیں گے۔"

"کون سا کام ہے؟ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" بیوی حیران ہو کر بولی۔

اُس نے غور سے بیوی کو دیکھا۔ لگتا تھا کہ اُس کے چہرے کو دیکھ کر ہی اپنے خیالات کو یکجا کرنے کی سوچ رہا ہے۔ جانے کون سے خیالات۔ کون سی حسرتیں۔ کون سی آرزوئیں۔ یہ سبھی چیزیں فقط ایک ارادے کی شکل میں آگے آ رہی تھیں۔ بس ایک ارادے کی شکل میں۔

بیوی کو دیکھتے ہی رسول خود سے گویا ہوا" جلدی ہے۔ کام ہونا چاہیئے۔ تبھی تو میں آزاد ہو جاؤں گا۔ یہ چراغ بھی تیل کی خاطر بجھنے نہ پائے گا۔ انگریز تو چلا گیا ہے۔ لیکن برف ابھی تک کیوں نہیں پگھل رہی ہے۔ لالہ بڑا آدمی ہے۔ لیکن ہم کیوں کر چھوٹے رہ گئے۔ ہمیں بھی تو بڑا بننا ہے۔ بچہ ہمیشہ بچہ ہی تو نہیں رہے گا۔ سلطان بھی ایک روز بڑا ہو کر دکھائے گا۔ جب یہ زندہ رہے گا۔ ہاہاہا۔ اُسے بھی زندہ رہنے کا حق ہے۔ آزاد لوگ آسانی سے نہیں مرجاتے۔ فرنگیوں کی اولادیں کیوں نہیں مرجاتیں۔ فرنگی۔۔۔ بازی گر دھوکے باز کیا سمجھ رکھا ہے تم نے۔۔۔ یہاں لاکھوں بازی گر ہیں جو ہمیں دھوکہ دے کر لوٹ لیتے ہیں۔ جو ہماری محنت، غیرت اور ہماری ہمت۔ ہمت۔۔۔ نہیں نہیں۔" رسول خشمگیں ہو کر برسنے لگا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور کانوں کی لویں سُرخ ہونے لگیں۔

"بازی گر کو اب یہاں برداشت نہیں کرنا ہے۔ اُس کو تو نکل جانا ہے۔ سلطان کو زندہ رہنا ہے۔ حمد کاک کا بیٹا محمد زندہ رہے گا۔ قادر شیخ کی بیٹی جانو زندہ رہے گی۔" یہ کہتے ہوئے رسول دروازے سے نکل گیا اور بیوی اُسے حیران آنکھوں سے دیکھتی ہی رہ گئی۔

شمس الدین شمیم

کُتّے کی دُم

میرے سبھی دوست اُس ندی میں نہاتے وقت مجھے چڑاتے رہتے تھے۔ ہر دوست کے یہاں اُس ندی سے متعلق ایک نہ ایک نئی کہانی تھی جسے لے کر وہ حظ اٹھاتا رہتا تھا، ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا تھا۔ یہ چیز میری برداشت سے باہر تھی۔ لیکن مصلحتاً میں خاموش بیٹھتا تھا۔ وجہ یہ تھی میری ہر بات پر لوگ ایک نہ ایک مصیبت کھڑی کرتے تھے۔ اصل میں میری بات بہت ہی سنجیدہ اور پُر معنی ہوا کرتی تھی۔ لیکن لوگ اس سے غلط مطلب اخذ کر کے میرا مضحکہ اڑاتے رہتے تھے۔

ندی کی آنکھیں چمکدار تھیں اور میرے دوست مجھے لالچ دے کر ندی کی آنکھوں کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن میں ٹال دیا کرتا تھا۔ اور صرف وہی باتیں سوچتا رہتا تھا جو میرے دوستوں کی سمجھ سے باہر ہوا کرتی تھیں۔ جس کا لالچ دے دے کر میرے دوست مجھے ندی کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے لیکن میں انہیں ٹال دیا کرتا تھا اور وہ باتیں سوچتا رہتا تھا جو کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ میں کہیں کھو جاتا تھا، چہرے پر مُردنی چھا جاتی تھی جس پر میرے دوستوں کو میری صورت دیکھ کر رحم آتا تھا۔ لیکن میں پھر بھی اپنی جگہ اٹل تھا۔ خوف کا غلبہ مجھ پر ضرور رہتا تھا لیکن اس کا اظہار نہ تو کسی دوست پر کرتا تھا اور نہ ہی دریا کو پتہ لگنے دیتا تھا۔

دوست گرجتے رہے، دریا بہتا رہا اور میں بھاگتا رہا۔ البتہ اس کا احساس کسی کو بھی نہ تھا۔ ان کی نظر میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ سورج حسبِ معمول نکل رہا تھا۔ روشنی ہوتی تھی، کام کاج چلتا تھا۔ چاند نکلتا تھا اور وقت، برفانی تودے کی مانند پگھلتا رہتا تھا۔ میں من ہی من ندی کے بارے میں سوچنے لگ جاتا تھا۔ لیکن اپنی سوچ کا اظہار کسی کے سامنے نہیں کرتا تھا کیونکہ میرے دوست نہ تو میری بات سننے پر آمادہ نظر آتے تھے اور نہ ہی میری باتیں ان کی سمجھ میں

آتی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری بات کی غلط تاویل نکالنے کے عادی تھے اور ہر بار میرے لئے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دیتے تھے۔

میں نے اپنے لب سی لئے تھے۔ ان کے لاکھ جتن کرنے کے باوجود بھی میں نے اپنے منہ کے بند تالے کھولنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

پھر یوں ہوا کہ یار دوستوں کی ٹولیوں میں دراڑیں پڑنے لگیں، ندی کا بہاؤ کم ہوتا گیا۔ دریا بھی سمٹتا گیا۔ میں نے ارادہ باندھا کہ لبوں پر مسکراہٹ لئے ندی کے قریب جاؤں اور اس سے کہہ دوں کہ وہ اپنا سارا پانی صرف میری ہی طرف موڑ دے تاکہ میں اس کے کنارے بیٹھ کر پھول نچھاور کر سکوں، اس کے موتی پرو دوں عطر مَل دوں اور اس پر اپنی جان نچھاور کر دوں۔ جوں توں کر کے، کچھ شرماتے اور کچھ لجاتے ہوئے میں نے اپنی خواہش ندی پر ظاہر کر دی۔

میرا ارادہ بھانپ کر ندی کو غصہ آ گیا، وہ بپھر گئی، طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور ندی کی لہروں نے اٹھا کر مجھے دور کنارے پر پٹخ دیا۔ میں خجل ہو کر رہ گیا جس پر میرے یار دوست مجھ پر آواز کستے رہے۔ ان کی ہنسی میں ندی کی ہنسی بھی شامل ہو گئی تھی۔

میرے ارادوں پر پانی پھر گیا تھا اور دل کی دل ہی میں رہ گئی تھی۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ لوگ میری ہر بات کا غلط مطلب لیتے ہیں، اور مجھے چاہئے تھا کہ چُپ رہوں۔ لیکن میں چُپ نہ رہا اور یہ دُرگت ہو گئی تھی۔

اب میں سنبھل گیا تھا۔ میں نے اپنی سوچ، سماعت اور گفتار پر پابندی لگا دی تھی۔ سب کچھ ٹھیک تھا لیکن میرے اندر کا احساس تھا کہ بار بار مجھ پر کچو کے لگا رہا تھا کہ میں غلط جگہ آ گیا ہوں۔ میری سوچ غلط ہے کے اوروں کے پاؤں میں کانٹا چُبھتے دیکھ کر میرے اندر کا درد جاگتا ہے۔ مجھے چاہئیے کہ اوروں کی طرح میں بھی کانٹا پھینک کر دریا کا سینہ چیر دوں۔ ایسا کرنے سے شاید دریا کے اندر بھی درد کا احساس جاگ اُٹھے۔ وہ چلا اُٹھے اور میں خوش ہو لوں، اوروں کی طرح، البتہ یہ بات سوچتے ہی میرے دل میں ایک اور احساس جاگنے لگا۔ میں نے جانا کہ ایسا کرنے سے مجھ سے گناہ سرزد ہو گا۔ مجھے اس قسم کا خیال دل میں لانے پر توبہ کرنی چاہئیے۔

چنانچہ میں سب کچھ وہیں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میرے یار دوست اس پر بھی میرا مضحکہ اڑانے لگے کہ "لو۔۔۔ اب چُپ سادھ لے کر ہی مطلب کی سوچ رہا ہے۔"

میں نے ان کی یہ بات بھی اَن سنی کردی۔ میرے یار دوست حسبِ معمول ندی میں ڈبکیاں مارتے رہے۔ کانٹوں سے ندی کا سینہ چیرتے رہے اور دم زدہ ندی ان کے تئیں محبت اور میرے لئے نفرت ظاہر کرتی رہی۔ ندی کی نفرت پر میں نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔۔۔۔ میری حالت گویا ’صُمٌ‘ ’بُکمٌ‘ ہو کررہ گئی۔ پھر بھی چلتا گیا، چلتا گیا اور ایک روز میں نے ٹھوکر کھائی۔ اور ٹھوکر کھا کر اچانک میری آنکھیں کُھل گئیں۔ میں نے دیکھا کہ دریا خُشک ہو گیا ہے۔ اور میرے دوست بھی کہیں بھاگ گئے ہیں۔

شیام لال سادھو

ڈھیٹ

روز کی طرح آج بھی وہ چاروں دوست تاش کھیل رہے تھے۔ رگھوناتھ ، جیون سنگھ ، غلام قادر اور تھامس گل۔ وہاں اور بھی کئی ڈرائیور تھے جن کی آپس میں اچھی دوستی بھی تھی لیکن نام صرف ان ہی چار دوستوں کا تھا۔ سینما کو جاتے تو اکٹھے جاتے۔ بچوں کے لیے کپڑے خریدتے تو ایک ہی دکان میں جاکر چاروں سودا ٹھہرا لیتے۔ ان کے لیے مثل مشہور تھی۔

ہندو مسلم سکھ عیسائی آپس میں ہیں بھائی بھائی

چنانچہ آج اکٹھے بیٹھ کر تاش کھیل رہے تھے۔ تُرف حکم کا رنگ تھا۔ رگھوناتھ نے پتے پھینٹے اور غلام قادر نے رنگ بول دیا۔ چاروں سرکاری موٹر خانے میں ڈرائیور تھے۔ اور بہت کم اکٹھے ملتے تھے۔ کیونکہ مہاراجہ کے یہاں مہمانوں کی اکثر ریل پیل رہا کرتی تھی۔ یہ مہمان یا تو دوسری ریاستوں کے راجے مہاراجے ہوا کرتے تھے یا ولایت کے انگریز افسر۔ کشمیر آکر وہ یہاں چپّہ چپّہ گھوم آتے تھے اور ڈرائیور ہمیشہ ان کے ساتھ جاتا تھا۔

"حکم کی دُکی سر ہو گئی ہے۔" تھامس گل تالی بجاکر بول اُٹھا۔ گل کا رنگ تو گندمی ہی تھا لیکن کشمیری زبان اچھی طرح بول نہیں سکتا تھا۔ اُس کی باتیں سن کر سب لطف لیتے تھے۔

"بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔" یہ غلام قادر نے کہہ دیا" جیت بہر حال ہماری ہو گی۔"

آسمان بالکل صاف تھا جیسے صفاچٹ آئینہ۔ دھوپ کُھل کر نکلی ہوئی تھی اور یہ چاروں سبزے پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے سروں پر بسنتی رنگ کی پگڑیاں تھیں اور بدن پر خاکی وردی جن میں لگے پیتل کے بٹن خوب چمک رہے تھے۔ چاروں جوان تھے۔ گل عیسائی تھا اور کہیں باہر سے آیا ہوا تھا۔ سردار جیون سنگھ کی داڑھی فکسر سے بندھی رہتی تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ فکسر استعمال کرنے کا فن اُس نے مہاراجہ پٹیالہ کے یہاں سیکھ لیا تھا۔ غلام قادر کی نیلی آنکھیں

تھیں۔ اور نیلی آنکھوں کی وجہ سے برادری میں اُس کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ رگھوناتھ باقاعدہ مندر جاکر وہاں سے ماتھا ٹیک کر آتا تھا۔

تاش کی یہ بازی ختم ہوگئی اور غلام قادر ہار گیا۔ جس پر گل اس کا مضحکہ اڑاتے ہوا بولا۔

"کہو بلّے۔ دیکھ لیا حکم کی دُکی کا کمال؟"

"ذرا صبر کر بکرے۔ اس قدر بے صبرا نہ بن۔" غلام قادر بولا۔

ابھی یہ لوگ کھیل ہی رہے تھے کہ ایک اور ڈرائیور ملک محمد نعرے لگاتا ہوا ان میں شامل ہو گیا۔

"ہندو مسلم۔۔۔" اس پر جیون سنگھ بول اٹھا۔ "چُپ کر بے۔ مت پھاڑ اپنا پہاڑی گلہ اور ہمارا دھیان کھیل سے ہٹانے کی کوشش نہ کر۔"

"میری بات تیری موٹی عقل میں آئی بھی ہے کہ نہیں۔" ملک بولا "یہ کھیل چھوڑ اب ڈیوٹی بھی کرنی ہے۔"

"ارے یارا بھی مت یاد دلا۔" رگھو نے گھبرا کر بولا "یہ بازی ختم ہونے دے۔"

"اب اتنی فرصت کہاں۔ جیون سنگھ کو ٹھیک تین بجے ٹنگمرگ میں رپوٹ کرنا ہے۔ وہاں سے اُس فرنگی کو لے کر آنا ہے۔ جو وایسرائے کے بیٹے کا دوست ہے، گل ابھی اور اسی وقت راجا پتھا پورم کو لے کر پہلگام جائے گا اور غلام قادر کو کل سویرے جرنیل کی بیوی کو لے کر راول پنڈی جانا ہے۔ اُسے ہر حالت میں شام سات بجے وزیر آباد میں رپوٹ کرنا ہے۔"

سبھی ڈرائیور یوں تو ڈیوٹی لگنے پر خوش تھے۔ وہ جانتے تھے ڈیوٹی دینے سے ہی وہ اپنی تنخواہ کے حقدار کہلائیں گے۔ بے کار بیٹھ کر کمایا ہوا پیسہ حرام کی کمائی ہوتا ہے۔ خاص طور سے ان کی ڈیوٹی راجوں مہاراجوں کے ساتھ لگتی تھی جو خوش ہو کر انہیں انعام بھی دیا کرتے تھے اور جو کوئی بھی شخص انہیں انعام دینے میں بخل سے کام لیتا تھا۔ اُسے یہ کنجوس اور کمینہ گردانتے تھے۔ ایک اور دل چسپی بھی تھی کہ یہ لوگ عام طور سری نگر سے راول پنڈی یا جموں جایا کرتے تھے۔ دو سو میل کا سفر تھا اور راستہ زیادہ تر سُنسان۔ ہر پندرہ بیس میل بعد دو چار مکانوں پر مشتمل چھوٹا سا گاؤں آتا تھا ورنہ تمام راستے پہاڑ، سڑک یا دریا ملتے تھے۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد کوئی گاڑی مخالف سمت میں گذر جاتی تھی جس میں دس پندرہ سواریاں بیٹھی ہوتی تھیں۔ مہمان مسافر سرکاری موٹر میں بیٹھے بیٹھے اوب جاتا تھا لیکن اکثر مہمان عموماً شراب ساتھ رکھتے تھے جس سے

وہ اپنی تکان زائل کرتے تھے۔ ان کے لیے دل بہلائی کے اور بھی سامان ہوتے تھے اور ایسے میں ڈرائیور کے نزدیک ان بڑے لوگوں کی حیثیت حمام میں بیٹھے ننگوں کی سی ہو کر رہتی تھی۔ چنانچہ جب ڈرائیور ڈیوٹی ختم کر کے آپس میں مل بیٹھتے تھے تو اس طرح کی باتیں دہرانے اور غیبت کرنے میں انہیں مزہ آتا تھا۔

"بھئی کیا کہوں۔ کیا کیا دیکھا ہے میری ان گناہگار آنکھوں نے، مہاراجہ نہ جانے کیا کیا کرتا رہا۔ جب مجھ سے بولا شوفر اپنا سر نیچے کرلو۔"

"یہ شہزادی بھی ایک بلا ہے۔ کیا کہوں کہ اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کو ساتھ لے جا کر کہاں کہاں ہو لیتی ہے۔۔۔۔"

چنانچہ غیبت کرنے میں ہر شخص کو مزہ آتا ہے۔ اور وہ لوگ اس طرح کی باتیں کر کے اپنی سختیاں بھول جاتے تھے۔

ایسے میں بازی ختم ہوگئی اور دونوں پارٹیاں اپنے اپنے پتے گننے لگ گئیں۔ گنتی جب مکمل ہوگئی۔ رگھوناتھ خوش ہو کر بولا۔ یہ سات ہوگئی ہیں۔ ہوگئی تسلی، غلام قادر کا پارٹنر جیون سنگھ تھا۔ دونوں بازی ہار گئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ غلام قادر غلط پتہ پھینک چکا تھا۔ اور اگر وہ غلط نہ کھیلتا تو ممکن تھا کہ بازی ان ہی کے ہاتھ لگ جاتی۔ غلام قادر اناڑی کھلاڑی بھی نہ تھا۔ لیکن جب اُسے ڈیوٹی کے بارے میں پتہ چل گیا تھا تو اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ اسے فکر لگ گئی تھی۔

غلام قادر کی گھبراہٹ سبھی کے علم میں تھی۔ اس کی وجہ سے وہ لوگ بھی فکر مند تھے۔ بات یہ تھی کہ کل صبح اس کو جرنیل کی بیوی کو لے کر راولپنڈی جانا تھا۔

جرنیل مہاراجا کا دوست تھا۔ آٹھ دس سال تک وہ کشمیر میں بھی رہ چکا تھا اور آج دلّی میں فوج کے اندر بڑا افسر تھا۔ کبھی کبھار یہ دونوں بیوی اکٹھے کشمیر آتے تھے لیکن اکثر عورت اکیلی ہی آیا کرتی تھی اور یہاں آکر سرکاری مہمان بن جاتی تھی اور یوں اسے کسی بھی چیز کی فکر نہ رہتی تھی۔ جرنیل تو بذاتِ خود بہت ہی اچھا آدمی تھا۔ نوکروں کی عزت کرتا تھا۔ مچھلی، مرغیاں یا دوسری چیزوں کا جب بھی شکار کرتا تھا نوکروں میں بھی تقسیم کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کو انعام بھی دیتا تھا۔ اس کے کھانے کا جہاں بھی انتظام ہوتا، ڈرائیور، شکاری، راکھے اور دیگر ملازمین اسی کے لنگر میں کھاتے تھے۔ لیکن جس قدر یہ سخی تھا، اسی قدر اس کی بیوی سخت تھی۔ کبھی کبھار تو وہ بھی مچھلی کا شکار کرتی تھی۔ لیکن ایک ایک مچھلی کا حساب رکھتی تھی۔ کسی کی مجال

نہ تھی کہ اس کے لنگر میں جا کر ایک کپ جائے ہی پی لیتا۔

پورے چوبیس گھنٹے تک ڈرائیور اپنے ساتھ رکھنے کے باوجود اُسے اس بات کی ہر گز فکر نہ تھی کہ کم سے کم اُس سے پوچھ ہی لیتی کہ آیا تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں۔ تم چائے تو پیو گے یا تمہیں بھوک تو نہیں لگی ہے۔

پھر بھی یہ ٹھیک ہی تھا کیونکہ ہر شخص کو اپنی عزت پیاری ہوتی ہے اور وہ اپنے کھانے پینے کا انتظام خود ہی کرتا ہے۔ لیکن اس کی کچھ اور عادتیں بھی تھیں کہ جن کی بنا پر ہر ڈرائیور اس سے خوفزدہ تھا۔ یہ تو جیسے کوئی ڈائن تھی۔ قدرت کی طرف سے اسے سرو جیسا دراز قد بخشا گیا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ ہلکے بھورے بال، چوڑی پیشانی اور ٹھوڈی کے دائیں طرف خوب صورت ساتل جو اسے سینکڑوں میں ممیز کرتا تھا۔ عمر اس کی پنتالیس کے لگ بھگ تھی۔ عام طور سے محفلوں میں خوش باش اور ہنس مکھ لگتی تھی۔ لیکن جس کسی کو بھی اس سے واسطہ پڑتا تھا۔ وہ کان پکڑتا تھا اور کہتا تھا کہ "خدا کے لیے اس منحوس کا نام نہ لو۔ جانے شام ہونے تک کون سی مصیبت نازل ہو جائے۔"

اور وہی ہوا بھی تھا۔ ایک بار بڈھا سنگھ کی ڈیوٹی اس کے ساتھ لگ گئی تھی۔ وہ اسے وزیر آباد سے سری نگر میں لے آیا۔ بڈھا سنگھ بہت شریف اور تجربہ کار ڈرائیور تھا۔ لیکن جرنیلنی کی شکایت پر معطل کیا گیا تھا۔ ایک بار امام دین کی ڈیوٹی اس کے ساتھ لگی تھی۔ اُسے جُرمانے کی سزا ہوئی۔ حال ہی میں نند لال کی ترقی ایک سال کے لیے روک دی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ جرنیلنی کو وہ راولپنڈی سے سری نگر لے آیا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ ہر وقت شکایت درج کراتی رہتی تھی۔ اور مہاراجہ کو اپنے ملازمین کو سزا دئے بنا، چارہ نہ تھا۔ اس کے سوا اور کسی شخص نے کبھی بھی ملازمین کے خلاف شکایت درج نہیں کی۔ لیکن جرنیلنی کی شکایت سے پھر بھی تغافل برتنا ناممکن تھا اور یہ لوگ ہمیشہ قربانی کا بکرا بن جاتے تھے۔ اور سزا بولتے وقت ان سے کوئی پوچھتا بھی نہ تھا کہ تمہیں کیا ہوا ہے اور یہ شکایت درج کیوں ہوتی ہے؟

ہم ابھی جرنیلنی کے ڈیل ڈول کے بارے میں بات کر چکے ہیں۔ اس میں ایک جسمانی نقص بھی تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ وہ کانوں سے بہری تھی۔ لیکن یہ کوئی ایسا عیب تو نہیں تھا کہ دور سے دیکھنے پر معلوم پڑتا۔ بات کرتے وقت اس کے سامنے اونچی آواز میں بولنا ہوتا تھا لیکن جہاں مطلب کی بات آتی۔ اونچا بولنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیوں کہ مطلب کی بات یہ دھیمی آواز

میں بھی سن لیتی تھی۔ البتہ جو بات یہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے سمجھانے کے لیے ڈھول پیٹنا ہوتے تھے۔ بولتے بولتے بولنے والے کا گلا خشک ہوتا تھا۔ پھر بھی اُس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ راستے بھر وہ صرف باتیں ہی کرتی رہتی تھی اور ایسا کوئی ڈرائیور نہ تھا جو اس کی اس عادت پر کھرا اُتر سکتا۔ یہ بھی نہیں جان سکتا تھا کہ ڈرائیور کے جواب سے وہ کیا مطلب اخذ کرلیتی تھی۔ بس بے چارے کی شامت آجاتی تھی۔

ایک اور عادت تھی کہ گاڑی اگر کم رفتار سے جارہی ہوتی یہ ڈرائیور کو ڈانٹ دیتی کہ "تم نابکار ہو۔ سری نگر پہنچنے میں تین مہینے لوگے۔ گاڑی تیز چلاؤ۔" اور اگر گاڑی تیز جارہی ہوتی تو ایک دم چلا اُٹھتی۔ شوفر۔ مرنا ہے جو اتنا تیز جارہا ہے۔ نالائق۔۔۔۔۔" اسی طرح کے حیلے بنا کر وہ ایک تو انہیں ڈانٹتی تھی اور بعد میں ان کی شکایت کرتی تھی۔

کبھی کبھار موڑنے کا بہانہ اور کبھی ہارن بجانے کا۔ کبھی وردی اور کبھی رفتار کبھی بات کرنے پر شکایت اور کبھی بات نہ کرنے پر شکایت۔

لوگ اس سے ڈرتے تھے چنانچہ اکثر خاموش رہ جاتے تھے۔ لیکن برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ کبھی کوئی ڈرائیور احتجاج بھی کر بیٹھتا تھا اور وہ اکثر اسی بات کا انتظار کرتی رہتی تھی چنانچہ جتنی بھی گالیاں اُسے یاد تھیں وہ اسے اردو میں سناتی تھی اور اسی وجہ سے لوگوں نے اس کا نام نیم چڑھی رکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جس کے بھی گلے پڑتی تھی اُسے ہرگز نہیں چھوڑتی بہت کوسنے کے بعد ان کی شکایت مہاراجہ کے آگے لے بیٹھتی تھی اور اُسے اپنے ہی ملازمین کو سزا دینے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ لیکن چار پانچ ماہ بعد انہیں معاف بھی کر دیا جاتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مہاراجہ اس عورت سے پوری طرح واقف تھا۔ البتہ تغافل برتنے کی اس میں ہمت نہ تھی کیونکہ ڈر تھا کہ کہیں وہ مہاراجہ کی کوئی شکایت وائسرائے کے سامنے نہ لے بیٹھے۔

اور آج غلام قادر کی باری تھی۔ سبھی دوستوں کو اس سے ہمدردی تھی لیکن کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی اس کے تینوں دوست آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ کس طرح اپنے دوست کو بچایا جاسکے کیونکہ جرنیلنی کے ساتھ ڈیوٹی لگنے کا مطلب ہی واردات ہونا تھا۔

جیون سنگھ کا مشورہ تھا "تم اس کو واپس ڈانٹ دینا۔ سرکار کی طرف سے تمہیں کوئی بڑی سزا نہیں ملے گی کیونکہ سرکار جانتے ہی ہیں کہ یہ کیسی ہے۔"

"کریلی اور نیم چڑھی۔" رگھوناتھ بولا جس پر سبھی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ لیکن اس

مشورے میں کھوٹ ہی کھوٹ تھی۔ کیونکہ سبھی کو ڈر بھی تھا کہ بے چارہ پھنس جائے گا۔

"نہیں۔ واپس ڈانٹنے سے کچھ نہ ہوگا۔ یہ ذلیل عورت ہے اور سرکار بھی اس سے ڈرتے ہیں۔"

"ہاں۔ پیر کی سی عزت اور چور کی سی خبر رکھتے ہیں۔ غلام قادر بولا" اس کا کچھ نہیں بن پائے گا۔"

"اگر ایک دو دن کی فرصت ہوتی رگھوناتھ بولا" میں تم کو چھٹی پر جانے کی صلاح دیتا بیماری کا بہانہ بنا کے۔ لیکن تو نے تو کل سویرے ہی جانا ہے اب یہ بہانہ چلنے والا نہیں۔ جاؤ جاکر خود کو پیر ودستگیر کے حوالے کردو۔"

"ہاں اب وہی مددگار ہے۔" غلام قادر بے بسی سے بولا۔



شام کو وہ گھر لوٹ آیا تو بہت ہی غمگین تھا۔ کھانا بڑی مشکل سے کھا سکا تھا لیکن نیند بالکل نہ آئی۔ بیوی سے کہہ دیا کہ صبح سویرے ہی راولپنڈی جانا ہے۔ وہ بولی کے خُدا کے حوالے۔ وہی تمہارا رکھوالا ہے۔ انشاءاللہ خوش خوش واپس لے آئے گا۔"

لیکن بیوی سے اُس نے اصل بات چھپا رکھی تھی۔ بہت سویرے ہی سے تیاریاں شروع کردیں۔ نماز پڑھ کر چائے پی لی اور پورے پانچ بجے گھر سے نکل آیا۔ اُس نے سوچ رکھا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔

غلام قادر کا باپ اُس کے بچپن ہی میں مر گیا تھا۔ اور یہ اپنی ماں اور بہن کو لے کر چاچا کے یہاں رہ رہا تھا۔ اس کی ماں خود بھی کافی محنت کش عورت تھی لیکن پھر بھی چاچا پر ان کا بار آپڑا تھا۔ چاچا تو محبت کرنے والا تھا ہی لیکن طبیعت سے زود رنج تھا۔ کبھی کبھار معمولی سی بات پر اس قدر بگڑتا تھا کہ ان کے آنسو نکل آتے تھے۔ لیکن ماں بس ایک ہی بات کی تلقین کرتی تھی کہ "قادر۔ خاموشی ہی میں بہتری ہے۔" اور چند لمحے بعد ہی چچا کا پارا اُتر جاتا تھا اور وہ ان کے پاس جاکر اپنے رویے کی معافی مانگتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ "بچوں میں تم پر قربان۔ میں نے تمہارا جینا حرام کر رکھا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں چرسی ہوں۔ مجھے معاف کر دیا کرو۔" چنانچہ غلام قادر کو ماں کی یہ تلقین اب بھی یاد تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ آج کی مشکل میں بھی ماں کی نصیحت ضرور کام آئے گی۔ "خاموشی ہی میں بہتری ہے۔"

گاڑی لے کر وہ جرنیلنی کے ہاوس بوٹ تک گیا۔ اور سلام کیا۔ سات بجے یہ لوگ سفر کو نکلے۔ چھتہ بل کے دو گدھے گاڑی کے آگے آگئے۔ غلام قادر نے ہارن بجایا۔ لیکن گدھے

اُڑ گئے۔ مجبوراً اُس نے بریک لگائے اور گاڑی، موڑ دی۔ بس پھر کیا تھا۔ جرنیلنی کو بُرا لگا اور وہ چالو ہو گئی۔ جانے کیا کیا بک رہی تھی لیکن قادر نے سنی ان سُنی کر دی۔ اُس نے اپنی زبان زور سے دانتوں تلے داب کر رکھ دی۔ وہ ماں کی اس نصیحت پر عمل پیرا تھا کہ "قادر! خاموشی میں ہی بہتری ہے۔" چنانچہ وہ کچھ نہ بولا اور جرنیلنی بہت دیر تک بکتی رہ گئی۔

آدھ گھنٹے کے بعد یہ لوگ ٹپن آ گئے۔ ابھی صبح کا وقت تھا اور سڑک پر ٹریفک بہت کم تھا۔ لیکن ڈرائیور کافی تجربہ کار تو تھا ہی۔ اس پر اُسے اس چیز کا بھی پورا خیال تھا کہ مبادا کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے چنانچہ ٹپن سے آگے جا کر جونہی اس نے ایک موڑ مڑنے کی خاطر رفتار کم کر دی، جرنیلنی جیسے تاک میں بیٹھی تھی۔ اُسے ایک بہانہ مل گیا اور چلائی۔

"ٹم بڑا نکما ہے۔ ٹم کو کوئی جانچ نہیں ہے۔ یہ ہارن بجانے کا کون سا ٹائم ہے۔ اس وقت کون سا ٹریفک ہے۔ جو سلو چلتا ہے۔"

یہ باتیں سن کر غلام قادر کا کلیجہ جل گیا۔ اُس کا جی چاہا کہ میم کو کھری کھری سنا دے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ یہ تو بہری ہے۔ جانے کیا سمجھ بیٹھے۔ مفت میں میں ہی مارا جاؤں گا۔ اس پر اب چلانا ہی ہوگا۔ اور اس طرح سارا دن کرکرا ہو جائے گا۔ اچانک اس کے من میں خیال آگیا اور اس نے اسی پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔

غلام قادر نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر میم کو بس اتنا سمجھا دیا کہ میں بہرا ہوں کانوں سے بہت کم سُنتا ہوں۔

جرنیلنی نے زور سے اپنا پاؤں فرش پر دے مارا۔ اس نے دانت چیرتے ہوئے رگیں تان کر کہا "ڈیم اِٹ۔" چونکہ اس کا تصوراتی ذہن پارہ پارہ ہو چکا تھا اور جان گئی تھی کہ اب اس کا کچھ نہ بگاڑ سکوں گی۔ چونکہ یہ بھی میرے ہی جیسا ہے۔ میری کوئی بات سُن ہی نہ سکے گا۔ لہٰذا اس کے آگے چلانے سے کوئی حاصل نہیں۔

اب وہ بہت کم بول رہی تھی۔ اور اچانک اس کے دل میں غلام قادر کے تئیں ہمدردی سی جاگ اُٹھی تھی۔ بارہ مولہ سے آگے جب یہ لوگ چناری تک آگئے تھے۔ یہاں جرنیلنی کے لنچ کا پروگرام تھا۔ اُس نے غلام قادر سے بھی کھانے کے لیے پوچھا۔ اور راول پنڈی پہنچ کر اُس کے ہاتھ میں دس روپے بطور انعام بھی رکھ دئے۔

یہ کام اُس نے آج تک کبھی نہیں کیا تھا۔

صوفی غلام محمد

کوئلہ چور

(غنی، عبدل اور محمد۔ یہ تینوں ایک ہی جگہ کام کرتے تھے۔ غنی آٹا گوندھتا تھا، خمیر بناتا تھا، تنور گرم کرتا تھااور پیڑے بناکران پر تل اور خشخاش ملتا تھا۔ عبدل، کے ذمے تنور میں لکڑی ڈالنا تھا۔ تِل دھونے تھے، پانی بھرنااور تختے پر سے خمیر کھرچ کراُسے صاف کرنااور لکڑی پھاڑنا تھا۔ محمد دونوں کا میٹ تھااور اس کا کام تھاتنور کے اندر روٹیاں، کُلچے اور باقرخانی وغیرہ بیل کرگرم تنور کی دیواروں پر لگانا۔)

غنی اور عبدل لڑکپن کے زمانے سے سلطان صوفی کے یہاں کام کرتے آئے تھے اور آج غنی کی عمر25 برس تھی۔ عبدل بھی اُسی کے عمر کا تھا۔البتہ یہ بات اب نہ تو غنی کو یاد تھی اور نہ ہی عبدل کو کہ کب سے وہ لوگ کام کرتے آئے ہیں۔ تب سے اب تک کتنے سال بیت گئے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہی اس کارخانے میں روٹیاں بنانے کی خاطر آئے۔ اور جب سے اب تک اسی کام پر معمور تھے۔ لیکن محمد۔۔۔دونوں کا استاد تھااور حال ہی میں اس کارخانے میں وارد ہوا تھا۔ اس سے پہلے یہ کام قادر دیکھا کرتا تھا۔ وہ بھی اپنے لڑکپن سے ہی سلطان صوفی کے یہاں کام پر لگ گیا تھااور کچھ عرصہ قبل مر بھی گیا تھا۔ اس کی جگہ سُلطان صوفی نے محمد کونوکر رکھ لیا تھا۔

سلطان صوفی کی دکان بازار میں ایسی جگہ واقع تھی جہاں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ اور اس وجہ سے اس کی دکان میں مقابلتاً زیادہ کام رہتا تھا۔ بھرے بازار میں صرف سلطان صوفی ہی کی تنوری روٹیاں بکتی تھیں۔ ان کے علاوہ بھی دکان اکنی، دوّنی کی باقرخانیوں سے ہمیشہ بھری رہتی تھی۔ سارادن وہ اندر سے ٹوکریاں بھر بھر کر روٹیاں نکالا کرتا تھااور دکان میں بنی کرسی پر سجایا کرتا تھا۔ زیادہ تر روٹیاں دکان میں سجاکر رکھنے سے قبل ہی بک جاتی تھیں۔ دکان اُس نے دُلہن کی طرح سجاکر رکھی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لوگ اس کے واری ہوتے جارہے

تھے۔اس کی سندھانی اخروٹ کی لکڑی کی بنی ہوتی تھی۔ جس پر خوبصورت نقش و نگار کندہ کئے گئے تھے۔اس میں وہ سکّے ڈالتا تھا۔سندھانی کے ایک طرف زینوں والی کرسی تھی جس پر جھالردار چادر پھیلادی گئی تھی۔ چادر صاف وشفاف تھی اور اس پر کلیچے، روٹیاں اور ژوجہ ورو سجائے جاتے تھے۔کرسی کے آخری زینے پر رنگ دار شیشے لگے کنستر قطار میں لگے تھے جن میں خاص ترتیب کے ساتھ باقر خانیاں، کلیچے، قتلم اور دیگر اقسام کی میٹھی اور نمکین روٹیاں سجائی جاتی تھیں۔کنستروں سے اوپر دیوار میں تصویریں آویزاں تھیں۔ایک تصویر میں جلی حروف میں ''اللہ'' اور دوسری میں ''محمد'' لکھا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ بھی قرآن شریف کی آیات الگ الگ فریموں میں بند قرینے سے لگائی گئی تھیں۔شاید بطور ایمانداری کی سند کے۔

دکان کی اندروالی کوٹھری میں کارخانہ تھا جس میں عبدل، محمد اور غنی کام کرتے تھے۔اس کمرے میں دھواں اور تاریکی بھری رہتی تھی۔اس قدر زیادہ کہ آدمی کے لیے کمرے میں داخل ہونا ناممکن تھا۔دھوئیں سے کمرے کی چھت کالی ہوگئی تھی۔اس کمرے کی نہ کوئی کھڑکی تھی اور نہ دروازہ۔اندر جانے کے لیے دکان کا ایک پٹ کُھلا رکھا جاتا تھا جہاں سے نہ صرف اندر کا دھواں باہر آتا تھا بلکہ باہر کی روشنی بھی اندر جاتی تھی۔اس کارخانے کے وسط میں ایک تنور تھا جو دن بھر گرم رہتا تھا۔یہ تنور دن میں پانچ چھ من لکڑی ہضم کرجاتا تھا۔تنور کے ایک طرف چھ فٹ گہری ایک خندق سی تھی جس کے اندر یہ تینوں ساتھی سارا سارا دن گھومتے ہی رہتے تھے۔کہنے کو تو کولہو کے اردگرد پھر بھی اس قدر جگہ ہوتی ہے جو بیل کے گھومنے کی خاطر کافی ہوتی ہے لیکن ان تین انسانوں کے گھومنے کی خاطر جو زمین کُھلی چھوڑ دی گئی تھی محض چارفٹ لمبی اور پانچ فٹ چوڑی تھی۔

صبح جب مُرغ بانگ دیتا تھا، یہ لوگ خندق میں اُتر جاتے تھے۔اور شام کے سات بجے تک بس وہیں گھومتے رہتے تھے۔کارخانے سے نکل کر انہیں آٹے والے گودام میں جانا ہوتا تھا جہاں یہ لوگ رات کے دس بجے تک آٹا چھانتے تھے۔اس کے بعد کھانا کھانے اور وہیں پڑے پڑے سو بھی جاتے تھے۔ایک یا دو گھنٹے کی نیند لے کر دوسری صبح منہ اندھیرے ہی وہ دوبارہ کارخانے میں جاتے۔اس طرح ان لوگوں کو دن اور رات کے بدلنے کا بہت کم پتہ چلتا تھا۔انہیں تو خبر ہی نہ ہوتی تھی کہ کب رات گئی، کب سورج نکلا اور کب دھوپ کھلی۔کب دن ڈوبا اور کب شام ہوئی۔ہزاروں لوگوں کی خاطر وہ اپنے ہی ہاتھوں روٹی، قتلم، کلیچے اور باقرخانیاں بیلتے اور

بناتے تھے۔ پھر بھی انہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ ان کے ہاتھوں کی بنی روٹیاں تو لوگ فخر سے اپنے رشتہ داروں کے یہاں تحفے میں لے جایا کرتے تھے۔ خوبصورت دیوان خانے میں بیٹھ معزز مہمانوں کو قہوے کے ساتھ کھلاتے تھے۔ ان کی بنائی ہوئی باقر خانیاں سیج پر بیٹھی دلہن کو بھی بہت پیار سے کھلائی جاتی تھیں۔ پھر بھی ایسی مزے دار اور کراری روٹیوں کے بنانے والے کاریگر دُنیا میں ہوتے ہوئے بھی دنیا والوں کی نظروں سے پوشیدہ تھے۔

اور جب سے غنی اور عبدل نے سلطان صوفی کے یہاں کام شروع کر دیا تھا، مشکل سے دو ایک بار ہی چھٹی لی تھی۔ ایک تو اس وقت جب سلطان کی پہلی بیوی مر گئی تھی۔ ماتم کی بنا پر سلطان صوفی نے اپنی دکان تین دنوں تک بند رکھی تھی۔ اُس وقت غنی اور عبدل نے سُکھ کا سانس لے کر کہا تھا کہ

"کاش اس طرح کے دن بار بار آتے۔"

دوسری چھٹی اس روز ہوئی تھی جب سلطان صوفی نے دوسری شادی رچالی تھی۔ اُس روز وہ نایدکدل کے محمد نانبائی کی کنواری بیٹی کو اپنی بیوی بنا کر گھر لے آیا تھا۔ دھوم دھڑ کے کے ساتھ وازہ وان لگوایا گیا تھا۔ اور بیوی کے آنے کی خوشی میں سلطان صوفی نے ایک دن کے لیے دکان بند کر لی تھی۔

لیکن اس طرح کے واقعات روز روز نصیب کہاں ہوتے ہیں۔ صبح اُٹھ کر وہ خدا سے یہی دُعا مانگتے رہتے تھے کہ دو دن کا آرام انہیں مل جائے لیکن آرام تو جب ہی مل سکتا تھا جب سلطان صوفی کی نئی بیوی مر جاتی یا سلطان صوفی خود ہی مر جاتا۔

کھانے اور کپڑے کے علاوہ بارہ روپے ہر ماہ تنخواہ کے بطور نقدی ملا کرتے تھے۔ کھانے میں دو وقت کے چاول اور دو وقت کی چائے تھی جو پورے ناپ تول کے بعد دی جاتی تھی۔ مٹی کے دو قابوں میں پاؤ بھر بھات اور اس کے اوپر مرچوں کے پانی میں اُبالی گئی سبزی جو عام طور پر ساگ کے دو چار پتوں تک ہی محدود ہوتی تھی۔ اس وجہ سے بھات کھا کر ان کی بھوک ہرگز نہیں مٹتی تھی۔ اور وہ بے حساب روٹیاں ژوجہ ورو کھایا کرتے تھے، سلطان صوفی سے چُھپ کر۔ وہ ان پر کڑی نظر رکھتا تھا کہیں یہ نظر بچا کر روٹیاں نہ کھائیں لیکن وہ بھی کائیاں تھے۔ گرم گرم روٹیاں دہکتے تنور کے اندر ڈالتے تھے اور پھر پونے ور سیخ کی مدد سے تنور کے نچلے سوراخ سے نکال کر رکھ دیتے تھے۔ تنور ہی کے بغل میں انہوں نے دیوار میں چھوٹا سا سوراخ بنا لیا تھا

جس کے اندر وہ دن بھر روٹیاں جمع کرتے تھے اور کام ختم ہوتے ہی آٹے کے گودام میں لے جاکر کھاتے تھے۔ اس طرح سلطان صوفی کے فرشتوں کو بھی اصل حقیقت کی خبر نہ ہوپاتی تھی۔

ان کی پوشاک ایک قمیض اور ایک شلوار پر منحصر تھی جسے وہ رات کو بھی پہنتے تھے اور دن کو بھی۔ قمیض کے دامن سے ہاتھ بھی صاف کرتے تھے اور اسی کی آستین سے ناک بھی۔ خمیر کی اتنی زیادہ تہیں ان کپڑوں پر چڑھ گئی تھیں کہ یہ سخت ہوکر بیل کی کھال بن گئے تھے۔ دونوں اپنی تنخواہ سلطان صوفی کے پاس جمع کراتے تھے۔ سال چھ مہینے میں جب کبھی ان کے ماں باپ یا کوئی رشتہ دار گاؤں سے آتا، اپنی تنخواہ اسی کے ہاتھ گھر بھیجتے تھے۔ تنخواہ واگذار کرنے میں بھی سلطان صوفی اکثر بے ایمانی پر اُتر آتا تھا اور پانچ روپے کے بدلے ان کے ہاتھ میں ڈھائی روپے تھما دیتا تھا۔

"دیکھو۔ پچھلے ماہ تم بیمار ہوگئے تھے۔ ایک دن میں گیارہ آنے کی دوا آگئی تھی اور پانچ روپے کا انجکشن لگا تھا۔"

"اور اس دن تم نے میرا نقصان بھی کردیا تھا۔ روٹیوں کا پورا تختہ جلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نقصان کے عوض دس روپے کی کٹوتی کی گئی ہے۔"

وہ صرف "جی جناب کرتے سلطان صوفی کی بات مانتے تھے۔ اس طرح اگر بارہ روپے ماہانہ تنخواہ کے حساب سے آٹھ ماہ کے 96 روپے بنتے تھے۔ وہ حساب میں صرف پچاس جوڑتا تھا۔ اور پیسے دیتے وقت اس میں سے بھی آدھی رقم دبالیتا تھا۔

کارخانے میں جاکر وہ بجلی سے چلنے والی مشین کی طرح کام کرتے تھے۔ ایک طرف غنی مٹھیاں بھینچے آٹا گوندھ رہا ہے۔ اور دوسری طرف عبدل چھاج ہلا ہلا کر تنور میں پڑی لکڑی کو ہوا دے رہا ہے۔ اور محمد سیخ ہاتھ میں لے کر تنور میں رکھی لکڑی کو جمارہا ہے یا سوختہ سوراخ سے نکال نکال کر چاروں طرف سے گرم کررہا ہے۔ تینوں کاریگر اپنی اپنی جگہ مصروف ہیں اور کبھی کبھی جاتے ہیں اور روٹیوں کی ایک کے بعد دوسری کھیپ تنور میں رکھتے جاتے ہیں۔ اور یوں انہیں اس بات کی خبر نہیں ہوتی کہ کب دن گیا اور کب رات شروع ہوئی۔ سلطان صوفی ٹوکریاں بھر بھر کے دوکان میں ڈالتا جاتا ہے اور ان سے روپے کماتا رہتا ہے۔ سلطان صوفی کے کون لوگ خریدار ہیں۔ یہ تینوں اس بات سے بھی ناواقف تھے۔ سلطان صوفی کبھی کبھار ہی کارخانے کے اندر جاتا تھا اور جب بھی جاتا تھا آنکھیں میچ میچ کر تنور کو گھورتا جاتا تھا۔

"سالے۔ اتنا تاؤ کیوں دے رہا ہے روٹیوں کو؟ آنچ دھیمی کر۔"

اور وہ چپ سادھے اس کا حکم مان لیتے۔

جب بھی کبھی کوئی گاہک سلطان صوفی کے پاس روٹیاں خراب ہونے کے متعلق شکایت کرتا تھا۔ سلطان صوفی ملازموں پر بگڑ جاتا تھا۔ سیخ اُٹھا کر ان کو پیٹتا بھی تھا لیکن وہ پھر بھی چُپ رہتے تھے اور بے زبان جانوروں کی طرح کام کرتے رہتے تھے۔ ایک روز عبد اللہ کی غلطی سے خمیر پتلا رہ گیا تھا اور روٹیوں کی شکل بگڑ گئی تھی۔ گاہک حسب معمول شکایت لے کر آگئے اور سلطان صوفی نے غصے میں آکر گرم گرم سیخ تنور سے نکال کر عبدل کے منہ پر دے مارا۔ اس کے چہرے کا گوشت جل گیا تھا جس کا نشان اب بھی اُس کے چہرے پر موجود تھا۔

سلطان صوفی نے اپنے ملازمین کو گویا باندھ کے رکھ دیا تھا۔ اُس کے سامنے ان کی گھگی بندھ جاتی تھی۔ وہ ان کو اُٹھتے بیٹھتے گالیاں دیتا رہتا تھا۔ معمولی سی غلطی پر بھی ان کے آباواجداد کی مٹی پلید کر کے رکھ دیتا تھا۔ ماں اور بہن کی گالی اس کی زبان پر رہتی تھی۔ اور وہ اس کی ہر گالی برداشت کر جاتے تھے۔ کیونکہ گالی ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا اس میں انہیں کوئی خرابی یا عیب نظر نہیں آتا تھا۔

"سُسرے۔" وہ کہا کرتا تھا "لکڑی کیوں زیادہ لگا دی ہے تنور میں ۔۔۔ تیری ماں ۔۔۔" لیکن وہ چاہے انہیں غنی اور عبدل کے نام سے پُکارتا یا سُسرے اور سالے کہہ کر بُلاتا، ان کو اس کا کوئی فرق نہیں پڑتا تھا ان کے دلوں سے خودداری اور غیرت مندی کے جذبات اسی طرح ختم ہو کے رہ گئے تھے جس طرح تنور کی آنچ سے ان کے بازوؤں کے بال۔ سلطان صوفی کا خیال تھا کہ نانبائی کے کارخانوں میں کام کرنے والے سبھی ملازم بزدل اور بے غیرت ہوتے ہیں۔ لیکن اُس کا یہ خیال ایک بار محمد نے غلط ثابت کر دکھایا تھا۔ محمد حال ہی میں سلطان صوفی کے کارخانے میں آیا تھا۔ لیکن آتے ہی اُس نے کارخانے کے پُر سکوت پانیوں میں پتھر سا دے مارا تھا اور اس میں حرکت پیدا کر دی تھی۔

یوں تو محمد صرف اپنا کام دیکھا کرتا تھا۔ دوسروں کے پھٹے میں ہاتھ ڈالنے کی اُس کی عادت نہ تھی پھر بھی اس بات پر اندر ہی اندر کُڑھتا رہتا تھا کہ سلطان صوفی ناحق ان دونوں پر برس پڑتا اور بات کرتے وقت بدزبانی سے کام لیتا ہے۔ سلطان صوفی جب بھی گالیاں بکتا تھا، محمد کو غصہ آجاتا تھا۔ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر اپنے دل سے کہتا تھا کہ ایک مکّے سے اس سُسرے کا منہ

بگاڑ کر رکھ دوں تا کہ دوبارہ گالی بکنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اُسے لگتا تھا کہ سلطان عبدل اور غنی کو نہیں بلکہ اصل میں اُسی کے نام گالیاں بک رہا ہے۔ اور ان کی حمایت میں سلطان صوفی سے تکرار بھی ہوتی رہتی تھی۔ آٹے کے گودام میں جا کر ایک بار ان کو غیرت دلانے کی کوشش بھی کی تھی اُس نے، لیکن اس کی باتیں اُس کی سمجھ میں بالکل نہیں آتی تھیں۔ گالی دینے کے بارے میں اُن کا فلسفہ تھا۔

"چھوڑو جی۔ گالی کیا تھوڑے ہی تھوک ہے جو چپک کر رہ جائے گی؟"

اور اُس دن سلطان صوفی آٹا خریدنے کی غرض سے گاؤں گیا ہوا تھا۔ اُس کی غیر حاضری میں محمد نے عبدل اور غنی کے ساتھ دل کھول کر باتیں کیں۔ اُس نے ان سے کہہ دیا۔

"تم لوگ تو کوئلہ چور ہو گئے ہو؟"

"کوئلہ چور؟" غنی اور عبدل نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

"ہاں اور کیا۔ تم نے نہیں سنا ہے کہ جب شیر جنگل چھوڑ کر شہر کا رُخ کرتا ہے۔ اُسے دیکھ کر گاؤں والے یک جٹ ہو کر چلاتے ہیں کہ "کوئلہ چور آ گیا۔ کوئلہ چور آ گیا۔"

پکڑ لو اور مار دو۔ شیر یہ نام سُن کر اپنی ساری شیخی بھول جاتا ہے۔ وہ گھبرا جاتا ہے اور دُم دبا کر بھاگ پڑتا ہے۔ اس میں گاؤں والوں کی چال ہے۔ وہ اگر شیر شیر کہہ کر شور مچانا شروع کر دیں۔ تو ڈر ہے کہ شیر کو اپنی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ سارا گاؤں تحس نحس کر کے رکھ دے گا۔"

محمد ان سے کہتا تھا۔

"تم بھی وہی کوئلہ چور ہو گئے ہو۔ شیر کی طرح تمہیں بھی اپنی طاقت کا احساس نہیں۔ ارے۔ ایک بار بھی اگر تم اس کے سامنے ڈٹ جاؤ۔ سلطان صوفی گالی دینے کی جُراُت بھی نہ کرے گا۔ صرف بارہ روپے کی عوض مہینے بھر تک تمہارے بدن کا لہو نہ چوس سکے گا۔ اور محض کپڑے اور کھانے کے عوض تم کو زر خرید غلام نہ سمجھ سکے گا۔"

چنانچہ اس دن کی باتوں نے غنی اور عبدل کی سوچ بدل دی۔ انہیں لگا کہ محمد سچ بول رہا ہے کیوں اس طرح کے خیالات ان کے ذہنوں میں کبھی بھی نہیں آئے تھے۔ ان باتوں سے ان کے اندر خود اعتمادی پیدا ہونے لگی تھی۔ چنانچہ دونوں سے محمد نے عہد لیا تھا کہ پھر کبھی اگر سلطان صوفی نے کسی ملازم کے ساتھ بد تمیزی کے ساتھ پیش آنے کی کوشش کی، تو تینوں مل

کر اُس کے ہوش ٹھکانے لے آئیں گے۔

اور دوسرے دن وہی ہوا بھی۔ سلطان صوفی نے حسبِ معمول عبدل کو گالی دی۔ جس پر عبدل پاؤں جما کر سلطان صوفی کے آگے کھڑا ہوا اور بولا۔

"اپنی زبان ٹھیک کرلو اُستاد۔"

"ہاں اُستاد۔" محمد بولا "تم نے ہمیں کیا سمجھ رکھا ہے۔ صرف گالیاں بکتے رہتے ہو؟"

"یہ گالیاں اب ہم سے برداشت نہیں ہونگی۔" غنی بول دیا۔

سلطان صوفی تینوں کا جواب پا کر جزبز ہو کر رہ گیا تھا۔ اُسے لگا تھا کہ دکان میں سجی ساری کی ساری باقرخانیاں اور کلچے ڈبوں سے باہر آکر سڑک پر پھیل رہے ہیں۔ اُسے لگا تھا کہ اُس کا تنور ٹوٹ کر ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے۔ گرم گرم سیخ تنور میں سے نکل نکل کر اُس کے منہ پر آرہے ہیں اور چہرے کا گوشت جلا رہے ہیں۔

محمد بولا "دیکھو اُستاد، غلطی ہم کرتے ہیں۔ ہماری ماؤں یا بہنوں کا ہماری غلطی سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ چیز کہاں تک کوئی برداشت کرے۔"

غنی اور عبدل نے بھی اپنی آواز محمد کی آواز سے ملالی تھی اور تینوں یک زبان ہو کر بولے تھے۔

"اب ہم سے برداشت نہ ہوگا۔"

سلطان صوفی سانس روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ چپ تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ ساری شرارت محمد کی ہے اس کی غیر حاضری میں اُسی نے ان دو کو پٹی پڑھائی ہے۔ چنانچہ وہ مصلحت سے کام لیتا ہوا خاموش رہا اور باہر نکل گیا۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ غصہ بگھارنے کی شکل میں یہ تینوں اس کا کارخانہ چھوڑ کر چلے جائیں گے جس میں اُسی کا نقصان زیادہ ہوگا۔

بہر حال یہ حادثہ بار بار اس کے دل کو کچو کے لگا تا رہا تھا۔

اور اس نے اس مسئلے کا علاج بھی ڈھونڈ لیا۔

اگلے دن اُس نے یہ کیا کہ غنی اور عبدل کو اکیلے میں اپنے گھر بلایا۔ وہاں ان کو خوب کھلایا پلایا اور یہ یقین دلایا کہ تمہاری تنخواہ میں ایک ایک روپے کا اضافہ بھی کر دیا جائے گا۔ البتہ تمہیں چاہئیے کہ محمد کے بہکاوے میں مت آنا۔ وہ بہت نرم گفتاری کے ساتھ ان سے بات کرتے ہوئے بولا۔

"دیکھو غنی۔ میں اگر اسی وقت تمہیں کارخانے سے نکال دوں تو کہاں جاؤ گے تم! بھیک سے بھی کھانا نہ ملے گا تمہیں۔ یہ شیطان ہے۔ جانے کیا کیا تمہارے کانوں میں گھول کے ڈال دیا ہے جو تم اس کی باتوں میں آگئے ہو۔ یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا۔ ارے۔ تم تو میری اولاد ہو۔ گھر کے افراد ہو۔ لیکن یہ سالا تمہیں بہکا رہا ہے۔ خراب کر کے چھوڑ دے گا تمہیں۔ کسی کام کا نہ رہنے دے گا۔ تم تو بڑے ہی آرام سے اپنی روزی روٹی کما رہے ہو، کیوں اس پر لات مار رہے ہو۔"

ان باتوں سے سلطان صوفی نے غنی اور عبدل کو اپنے بس میں کر لیا اور یوں اُس سلگتی چنگاری کو بجھانے میں کامیاب ہوا جو ان دونوں میں محمد نے ڈال دی تھی۔

اگلی صبح جب عبدل اور غنی کے ساتھ ساتھ محمد بھی کارخانے میں داخل ہونے لگا تھا، سلطان صوفی نے اُسے روک لیا اور کہا۔

"میرے باپ۔ تم چلے جاؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔"

"وجہ؟ محمد نے سوال کیا۔"

"وجہ وغیرہ میں نہیں جانتا۔ تم شرافت سے نکل جاؤ۔ ورنہ تمہیں جوتے مار مار کے نکال دوں گا۔ کیا سمجھتے ہو؟ ان شریف آدمیوں کو ورغلا کے رکھ دو گے؟ تم نے شاید سلطان صوفی کا اصل چہرہ خواب میں بھی نہیں دیکھا ہے۔"

محمد نے لاچار ہو کر غنی اور عبدل کو دیکھا۔ وہ دونوں سر جھکائے اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہ اس سارے واقعے سے بالکل لاتعلق لگ رہے تھے۔ چنانچہ مسکراتا ہوا وہ کارخانے کے خندق سے باہر آیا۔ اور دونوں کی اُور ایک نظر ڈالتا ہوا بولا۔

"کوئلہ چور"

سلطان صوفی کوئلہ چور کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ البتہ غنی اور عبدل سُن کر بے چین ہو گئے۔ لاکھ چاہا کہ محمد کے ساتھ ساتھ وہ بھی کارخانے سے باہر آئیں۔ لیکن ٹانگیں ہی بے حرکت ہو کر رہ گئیں۔

عزیز ہارون

فریب

دن کافی نکل آیا تھا، شاید گیارہ بج رہے تھے۔ آسمان سے بطخ کے پاؤں جتنے برف کے گالے گر رہے تھے۔ شدید برف باری کی بنا پر روشنی اتنی کم ہو رہی تھی کہ دن بھی رات لگ رہا تھا۔ ووستہ رحمان کے یہاں دروازے کے باہر برآمدے میں سمٹا سائتا سر اور دُم لپیٹ کر پڑا ہوا تھا۔ یہاں وہاں سے بچوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ووستہ رحمان کا بیٹا سلاما کھڑکی کے طاق میں دُبک گیا تھا اور باہر گرتی ہوئی برف کے گالے گن رہا تھا۔ خود ووستہ رحمان پھٹی پرانی چادر اوڑھے سر دھقے کی نلی منھ میں دبائے کش پہ کش لگا رہا تھا۔ وہ ایک نظر کریم کو دیکھ رہا تھا اور ایک نظر باہر گرتی برف کو۔ ایسا خاموش تھا کہ لگتا تھا کسی گہری فکر میں ہے۔ خود کلامی کرتا ہوا وہ من ہی من مسکرا رہا تھا۔ اور کبھی ہاتھ اٹھا کر اپنی انگلیوں سے اپنے سر کو دباتا جا رہا تھا۔

اچانک فضا میں برفانی چڑیا کی آواز گونجنے لگی۔ سلاما اپنے باپ سے کہنے لگا۔ ”بابا مجھے لگتا ہے کے برف آج سارا دن گرتی ہی رہے گی۔ ہمارا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ دیکھو۔ برفانی چڑیا بول رہی ہے۔“

ووستہ رحمان نے لمبی سی آہ بھری۔ وہ بولا ”اس سے اچھا تھا کہ دُنیا کو ہی تباہ کر کے رکھ دیتا۔ پر اُس سے یہ نہیں ہو رہا۔“ وہ کریم سے مخاطب تھا۔

”اب کھڑے بھی ہو جاؤ۔ یوں گھٹنوں میں سر دئے بیٹھنے میں کیا ملے گا؟ فکر نہ کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ سب ٹھیک کر دے گا۔“ اس پر کریم نے انگڑائی لی اور پاؤں پھیلا دئے۔ وہ پھیرن کے اندر پڑی کانگڑی کی گرم گرم راکھ ہاتھ سے اُلٹتے ہوئے بولا

”تمہیں کیا چاہیئے بابا؟“

”یہ کاہلی چھوڑو۔ اُٹھ کر میری آری اور لپسولی ڈھونڈ لاؤ۔ جب تک میں دو چار سینیاں بنالوں۔ شاید میرے بازؤں میں بھی گرمی آجائے۔“

کریم نے چھوٹے بھائی سے کہا۔"اور تم یہ حقہ ادھر کردو۔" سلام نے بھائی کی فرمائش سنی۔ طاق پر سے اُتر آیا اور حقہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

کریم نے باپ سے کہا" بابا۔ سینیاں کون سی لکڑی کی بناؤ گے ؟"

"لے آؤ یار کچھ بھی۔ یار دیکھو، اوپر چھت میں گرمیوں میں خریدے گئے بالن کا کوئی ٹکڑا وغیرہ ہوگا۔ شاید اوپلوں کے ڈھیر میں پڑا ہوگا۔ بس وہی اُٹھالاؤ۔"

سلام بولا" کاکا۔ تمباکو ختم ہے۔، تمہاری چلم میں رکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ اب کیا کروں؟"

"یار ڈبے پڑی راکھ میں سے ادھ جلے تمباکو کا کوئی سا ٹکڑا دیکھ لو۔"اور سلام نے راکھ کھنگالنا شروع کردی۔

"سلاما۔ جا کے اپنی ماں کو بُلا لاؤ۔" ووستہ رحمان نے کہا۔"دوپہر ہونے کو آئی ہے وہ آکر کھانا پروس دے گی۔"باپ کا حکم ملتے ہی سلام چلم چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور ننگے پاؤں باہر جانے لگا کریم نے ایک دم روک لیا اور کہا۔

"کھڑاؤں لے لے بے وقوف! شام ہوتے ہی تیری کھوں کھوں شروع ہو جائے گی۔"

لیکن سلام نے اَن سنی کردی اور سفید اور گھنی برف پر ننگے پاؤں دوڑتا چلا گیا۔

ووستہ رحمان بولا"کوئی نہیں جانے دو کچھ نہیں ہوگا۔ جب میں چھوٹا تھا، برف پر چار چار کوس پیدل جایا کرتا تھا۔ کبھی میرے پاؤں میں شیونہ لگا حالانکہ اب سے دس گُنا بھاری برف گرتی تھی اُن دنوں، اور میں اُسی برف پر گھر سے بٹوارہ پیدل جایا کرتا تھا، وہاں ہم ایک مکان کی چھت میں شینگل ڈالنے جاتے تھے۔ میری اُجرت دو آنے روز کی تھی اور میرے ابا، خدا ان کو جنت نصیب کرے، بارہ آنے روز کے کماتے تھے۔ اُن پیسوں میں بھی بڑی برکت تھی۔ آج کے لڑکوں کو دیکھو، کانگڑی سنبھالنا بھی ان کے لیے مصیبت بن گیا ہے۔ آج کی یہ ناز برداری اُن دنوں نہیں تھیں۔ ووستہ رحمان کی تقریر ابھی جاری تھی کہ باہر آنگن میں اُس کی بیوی چلائی۔ وہ دور ہی سے اپنے خاوند پر بگڑ رہی تھی۔

"بس اندر ہی بیٹھے رہو گے، کانگڑی لے کر۔ باہر کی تم کو کچھ خبر ہی نہیں۔ آکر دیکھو پورے دو گز برف جم گئی ہے۔"

ووستہ رحمان جھینپ گیا۔ جھینپ کر کھڑا ہو گیا اور کھڑکی سے جھانک کر بیوی سے بولا

اب کیا ہوا ہے، جو اتنا چلا رہی ہو؟"

"دیکھتے نہیں چھت پر کتنی برف جمع ہو گئی ہے؟ یوں بے کار بیٹھنے سے اچھا تھا کہ تم چھت کی فکر کرتے۔ اس پر پڑی برف نیچے گرا دیتے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے ہاتھ میں رکھا مٹی کا کاسہ آنگن میں پڑی اوکھلی پر رکھ دیا۔ کاسے میں ریشم کو کویے تھے۔ کاسے پر برف جم گئی تھی اور دور سے وہ ڈبا سا لگ رہا تھا۔ ووستہ رحمان کی بیٹی بھی آ گئی تھی۔ اُس کی گود میں بچہ تھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے سلاما آ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں بید کی ٹوکری تھی۔ ٹوکری میں کاتے گئے ریشم کے چھلے تھے۔ ووستہ رحمان کی بیوی کریم سے مخاطب ہوئی۔

"بیٹے۔ تم ذرا چھت پر جاؤ اور برف نیچے گرا دو۔ ساری چھت برف کے بوجھ سے دب جائے گی۔ اس کی لکڑیاں چرمرانے لگی ہیں۔

"اب اندر آ بھی جاؤ۔" ووستہ رحمان بیوی سے بولا۔ "کھانا کھا کر ہم سبھی اوپر جا رہے ہیں، برف گرانے۔ تم بس تماشا کر رہی ہو۔ خود تو گھر میں بیٹھتی ہی نہیں۔ دیکھو، ابھی بھی ایک پاؤں چوکھٹ کے باہر رکھا ہوا ہے۔

کریم بولا "اندر آ جاؤ ماں۔ کھانا کھاتے ہی برف بھی اُتار دیں گے۔"

"ارے تو تو اپنے باپ سے بھی گیا گزرا ہے، کام چور۔ خطجی!! بیٹی تم اندر چلی آؤ۔ بچے کو سردی لگ رہی ہے۔ سلاما! تم یہ ساری چیزیں اٹھا کر اندر لے جاؤ اور موسلی اٹھا کر باہر لے آؤ۔ اس چھت کو کم سے کم موسلی ہی کا سہارا دوں گی۔ مجھے لگتا ہے یہ برف کے بوجھ سے بیٹھ جائے گی۔"

سلاما اپنی ماں کی خشمگیں آنکھیں دیکھ کر ڈر گیا اور دوڑ کر اندر چلا گیا اور موسلی اٹھا کر ماں کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس نے موسلی کو ٹکانے کی خاطر کھڑی کر دی اور فخریہ لہجے میں خاوند کو گھور کر بولی۔

"تمہیں گھر کی کیا پڑی ہے۔ اپنے آگے پیچھے دیکھتے ہی نہیں۔" وہ اندر آ گئی، ووستہ رحمان پہلے ہی آلتی پالتی مارے کھانے کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ بیوی نے دیکھا تو اور چڑنے لگی۔

"خطجی! تمہیں بھی بھوک لگی ہو گی۔ گلو کو کریم کاکا کی گود میں ڈال دو اور اُٹھا کر یہ سارے برتن یہاں لے آؤ۔ یہاں گھر میں سبھی کی نظریں کھانے کی اُور لگی رہتی ہیں۔ جاڑا آتے

ہی ان کی آنکھیں گھٹنوں میں در آتی ہیں۔ ان پر کاہلی چھا جاتی ہے۔۔۔۔۔ ووستہ نبر کو دیکھو یوں تو کل سے ہی کام سیکھنے نکلا تھا لیکن آج دیکھو ہر وقت کام میں ہی مصروف رہتا ہے۔ بے کار نہیں بیٹھتا۔ آج بھی کہیں کام لے رکھا ہے۔ مجھ سے بات ہوئی تو کہنے لگا کہ اور بھی کئی کاریگروں کی ضرورت ہے وہاں اب تم ہی بتاؤ۔ میں کہاں اُس کے سامنے اپناد کھڑا روتی؟ ایک طرف اگلی صبح کے لیے گھر میں چاول نہیں اور ایک طرف تیرا باپ ہے کہ بات ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکال دیتا ہے۔"

ووستہ رحمان بگڑ گیا اور بولا "تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں؟ چوری کروں یا سینده لگادوں؟ تم گھر میں بیٹھی صرف بک بک کرنا جانتی ہو۔"

بیوی بولی "ووستہ نبر تم سے گیا گزرا ہے کیا جو کام ڈھونڈ نکالتا رہتا ہے؟ تمہارے لئے کہہ رہا تھا کہ تم بھی اگر آجاتے تو ایک سے دو بھلے ہو جاتے۔ اس میں اُس کا نقصان بھی کیا تھا۔ تم اپنا کام دیکھتے اور وہ اپنا۔" لیکن کریم نے ماں کی بات کاٹ ڈالی اور بولا

"ماں تم بھی بس ایک ہی بات کے پیچھے لگ جاتی ہو۔ کیا تمہیں یاد نہیں کے پچھلے سال کیا ہوا تھا؟ ایسی ہی برف گر رہی تھی۔ وہ ہم دونوں باپ بیٹوں کو بہلا پھسلا کر لے گیا بہت سارے وعدے کئے تھے ہمارے ساتھ۔ لیکن جب کام پورا ہوا تو چار آنے روز کی مزدوری نہ ملی۔ آج بھی وہ گڑبڑ کرے گا۔" اس پر ماں کو غصہ آیا اور کریم کو ڈانٹ کر بولی۔ "ہاں۔ ووستہ نبر کی عادت ہے کہ سب کے ساتھ دھوکہ کرتا ہے۔ اسی لئے تو لوگ اس کے آگے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں۔ ایک تم ہو دیانت دار۔۔۔۔۔"

ووستہ رحمان چلایا "اب چپ بھی رہو خُدا کے لئے۔ کھانا تو کھا لینے دو۔ جانتا ہوں میں کہ آج کل تیری نبر کی بیوی کے آپس میں گاڑھی چھن رہی ہے۔ لوگوں کا کیا ہے۔ ہم اگر خون بھی بہائیں۔ اُن کی چاندی ہو جائے۔"

وہ بولی۔ "میری باتیں سُن کر تو تمہارے اندر کی آگ بھڑکنے لگتی ہے۔"

کریم بولا۔ "ماں۔ تم ہی ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اب بس بھی کرو۔" سلاما اور خطجی خاموش بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ وہ کبھی ماں کو اور کبھی اپنے باپ کو دیکھتے جا رہے تھے۔

"میرا کیا ہے۔" وہ بولی "تمہارا ہی بہنوئی ہے جس طرح بھی بن پڑے گھر چلاتا ہے اپنا۔" فرق صرف یہ ہے کہ تمہاری طرح انجمن وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑتا مجھ سے کہہ رہا تھا

کہ اگر میں بھی اوروں کی طرح انجمن کی ماتحتی میں رہتا تو اب تک میرے بھی گھر میں فاقے لگ گئے ہوتے۔" یہ بات سُن کر نوالہ وودستہ رحمان کے گلے میں اٹک گیا۔ اس نے پانی کا ایک گھونٹ لیا اور بولا" رہنے دو اس کی وکالت۔ جانتا ہوں تمہاری غرض۔ تم عورتوں نے جب سے سرکاری جلوس میں جانا شروع کر دیا ہے، گھر میں بھی بھاشن دیتی رہتی ہو۔"

کریم ہنس کر بولا" کیوں نہ ہو۔ لیکن ماں کو ان چیزوں کی کیا خبر۔"

"کیا نہیں خبر؟" ماں بگڑ کر بولی" پچھلے تیس سال کی مہاجن کی رقم ہے۔ جب سے اُس کے یہاں رقم نہیں گئی۔ ابھی تک قانون بنایا ہے۔ اُن لوگوں کو اب کچھ بھی نہیں دینا ہوگا جن لوگوں نے سو روپے کا قرضہ لے کر ڈیڑھ سو روپے بطور سود مہاجن کو دئے ہونگے۔ تم بتاؤ۔ تمہارے نام اصل زر کے پانچ اور اسیر تیس سال کا سود اب بھی باقی ہے۔ وودستہ رحمان نے یہ بات سُنی اور گنگ ہو کر رہ گیا۔

"اب چھوڑو بھی اس ذکر کو۔ بیٹے، تم اٹھو میری جیب میں دو آنے رکھے ہیں۔ آنے آنے کا تمبا کو لا کر سیدھا وودستہ نبر کے یہاں جاؤ اور اُس کو یہاں بُلا کر لے آؤ۔"

کریم کو ناچار جانا ہی پڑا۔ باپ کی جیب سے دُونّی نکال کر وہ ماں سے کہنے لگا۔

"ایک اکنّی اور ہوتی تو میں چائے کے لیے دودھ بھی لے آتا۔" باپ کچھ نہ بولا۔ اُس نے یہ بات ان سنی کر دی۔ لیکن کریم کے جاتے بیوی بولی" تمہاری جیب میں بس یہی ایک دُونّی تھی؟" لیکن وودستہ رحمان نے یہ کہہ کر بات ٹال دی۔

"تم تو چھت سے برف ہٹانے کو کہہ رہی تھی۔ موسم زیادہ خراب ہو رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر ساری رات اسی طرح برف گرتی رہی تو چھت ضرور ٹوٹ جائے گی۔ کہیں سے چتّو ہی مل جاتا، یا بیلچہ ہوتا" اور بیوی بولی" اب آنے دو کریم کو، وہی ڈھونڈ کر لا دے گا۔ شاید پچھلے سال والا چپوا اوپر کہیں پڑا ہوا ہو۔" یہ کہتے ہی وہ کچن سے نکل کر بازو والے کمرے میں گئی اور وہاں جا کر کھڑکی کی طاق میں رکھا برتن نیچے اتار لائی۔ برتن زمین پر رکھ کر وہ ریشم کو کویوں سے تار نکالنے لگی۔ کریم اور وودستہ نبر بھی آ گئے۔ وودستہ نبر اندر آیا اور آتے ہی رحمان سے بولا۔ "کیوں جی! اب گھر کے اندر بیٹھنے سے ہی مزہ ملتا ہے کیا؟" وودستہ رحمان مُسکرایا اور بولا

"آؤ بھئی۔ بیٹھو۔ بیٹے تم ذرا نقہ تیار کرو۔" اس کے بعد وہ وودستہ نبر سے بولا" سُنا ہے تم نے کام شروع کیا ہے۔"

''ہاں بھئی۔ بس چھوٹا سا کام ہے۔ یوں سمجھ لو کہ گھر کا خرچہ چل جائے گا۔'' ووستہ نبر بولا ''فوجیوں کے لئے کچھ پلنگ بنانے ہیں۔ آدمی یہ نہ کرے تو اور کیا کرے ؟''

ووستہ رحمان بولا۔ ''ریٹ میں لکڑی بھی شامل ہے یا صرف بنانے کی اُجرت ؟''

''صرف اُجرت ہے بھائی۔ کہاں کی لکڑی ؟'' ووستہ نبر بولا۔

کریم نے باپ سے مخاطب ہو کہنا شروع کیا'' بابا۔ یہ کل ہی کہہ رہے تھے کہ ٹھیکے دار کاریگروں کو بہکا رہا ہے۔ وہ لوگوں سے کہتا پھر رہا ہے کہ کوئی کاریگر انجمن سے الگ رہ کر کام نہیں لیگا۔ ''کوئی بھی کاریگر انجمن سے غداری نہیں کرے گا۔''

اس پر ووستہ نبر چڑ گیا اور بولا'' اسی بہانے تو انجمن کے کرتا دھرتا آپس میں بندر بانٹ کرتے ہیں۔''

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟'' ووستہ رحمان نے پوچھا۔

''ٹھیکے دار نے۔ اور کس نے ؟ وہ لوگ اس کے پاس جھولی پھیلا کر گئے تھے۔ اُس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ کام انجمن کی وساطت سے بٹنے کی بجائے غریب ترکھانوں میں تقسیم ہو گا تا کہ ہر گھر میں چولھا جل سکے۔ ٹھیکے دار نے یہ بھی کہا کہ اُس کے پاس خراد چلانے والے بھی یہی کام کرنے کی خاطر گئے تھے۔ اُن کے علاوہ وہ لوگ بھی جو انجمن میں خاصا رسوخ رکھتے ہیں۔ لیکن ٹھیکے دار کا کہنا ہے کہ اُس نے منع کر دیا، حالانکہ مشین کی مدد سے یہ کام بہت کم وقت میں مکمل ہو سکتا تھا۔''

''بھئی چھوڑو یہ باتیں'' ووستہ رحمان بولا'' ٹھیکے دار کا کیا ہے۔ وہ تو ایسے ہی باتیں بنا بنا کر اپنا کام نکالتا رہتا ہے۔ یہ بتاؤ تمہیں کیا ریٹ مل رہا ہے ؟''

اس سوال پر ووستہ ذرا دیر کے لئے تذبذب میں پڑ گیا۔ آخر سوچ کر وہ بولا'' ریٹ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ پھر بھی جاڑے کے دنوں میں چائے پانی کا خرچہ نکل ہی جائے گا۔ فی نگ ساڑے چار روپے مقرر ہیں۔'' کریم نے یہ ریٹ سُنا تو ہڑ بڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بولا'' توبہ میری توبہ۔ ساڑھے چار روپے ؟ استاد جی! ایک پلنگ بنانے میں دن میں کم سے کم چار آدمی لگیں گے۔ اس حساب سے دیکھو تو اُجرت سوا روپیہ بھی نہیں بنتی۔''

''ٹھیکے دار نے بیس روپے فی نگ کا ٹینڈر بھرا ہو گا۔ خیال کرو۔

ایک ہزار کے ٹینڈر میں وہ کتنی رقم بٹور لے گا؟ کل کو وہ ان ہی روپوں سے ایک اور

کوٹھی تعمیر کرے گا۔ موٹر خریدے گا یا حج کو جائے گا۔ کوئی پوچھے بھی تو جواب ہوگا کہ بس یہ میرے خدا کا فضل ہے۔"

ووستہ نبر جان گیا تھا کہ یہ لوگ دام میں آنے والے نہیں۔ کچھ سوچ کر وہ ووستہ رحمان کی بیوی سے بولا" بہن جی۔ میں نے آپ سے اپنے گھر میں ہی کہہ دیا تھا کہ یہ لوگ بحث کریں گے۔ میری نظر میں اور بھی کئی کاریگر ہیں جو خوشی خوشی اس کام کے لئے حامی بھریں گے۔ انہیں بھی کام کی اشد ضرورت ہے۔۔۔ اور ان لوگوں کو دیکھو، خود اپنی روزی روٹی پر لات مار رہے ہیں۔"

ووستہ رحمان کی بیوی اپنے خاوند کو ڈانٹ کر بولی۔ "اب بولو۔ کیا جواب ہے تمہارا؟ گھر میں بے کار بیٹھے کانگڑی تاپتے رہو گے یا کام پر جاؤ گے۔۔۔ یہ سچ ہے کہ میں نے ہی بھائی صاحب سے آپ کو کام پر لے جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔"

ووستہ نبر موقعے کی تلاش میں تھا، اُس نے جھٹ سے بٹوہ نکالا اور ایک روپے کے بیس نوٹ گن گن کر ووستہ رحمان کے آگے ڈال دئے۔ ووستہ رحمان اپنے بیٹے کریم کی اُور دیکھنے لگا اور کریم کی نظریں اپنی ماں کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ تینوں خاموش تھے۔ نوٹوں کو دیکھتے ہی ووستہ رحمان کو چاول بیچنے والی وہ عورت یاد آگئی۔ اُس کا قرضہ ابھی تک اُس پر واجب تھا۔ وہ کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ ووستہ نبر نے کہا۔

"ہاں۔ ایک بات کہہ دوں کہ دونوں باپ بیٹے آپس میں مشورہ کرلو۔ مجھے کوئی جلدی نہیں اور نہ ہی تم پر زبردستی کر رہا ہوں۔ کل تک مجھے جواب دینا۔" اتنا کہہ کر اس نے جوتے پہن لئے اور جانے کو تیار ہو گیا۔

ووستہ نبر کے جانے کے بعد ووستہ رحمان کی بیوی نے سلام سے کہا۔ "تم بازار جاؤ اور وہاں سے دودھ لے کر آؤ۔ جب تک کہ خطجی چائے بنائے۔ تم چھت کی برف جھاڑ دو۔" یہ کہہ کر اُس نے پاس پڑے نوٹ اٹھا کر سلام کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ ووستہ رحمان سے بولی۔

"دیکھ لیا تم نے۔ خُدا کس طرح کام بناتا ہے۔ مجھے مہینے بھر کی راشن کی فکر لگی تھی کہ کہاں سے آئے گی۔ ان روپوں سے کم سے کم آدھے مہینے کا انتظام ہو ہی جائے گا۔"

ووستہ رحمان گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کبھی نوٹوں کو دیکھ رہا تھا اور کبھی بیوی کو۔

علی محمد لون

خلا

وے کیوم۔ یہ لا محدود وے کیوم روز بروز پھیلتا ہی جا رہا ہے۔

یہ وے کیوم زمین سے اوپر کہیں خلا میں نہیں بلکہ میرے ہی دل میں دماغ میں پیدا ہو رہا ہے۔ یہ وہ خالی پن ہے جو کبھی بھی پُر نہیں ہو سکتا۔

دن اور رات کا یہ چکر بے معنی ہے
دن نکلا اور روشنی پھیلی
شام ہوئی اور رات آگئی۔

مان لو اگر دن بھی بیت گیا اور رات بھی ختم ہوئی، میرا اس سے کیا واسطہ ؟ میں اس بارے میں کچھ سوچ نہیں سکتا۔ میں کوئی انٹروورٹ نہیں، لیکن میرے دوستوں کی مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں انٹروورٹ ہوں۔ شاید اس لئے کہ مجھے باتیں بنانا نہیں آتا۔

"انٹروورٹ۔" ہونہہ۔

اپنے اس خطاب پر کبھی کبھار میں میری ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔ زوروں کا قہقہہ نہ سہی ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ چھا جاتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے اپنے لب سی لیتا ہوں۔ مجھے بات کرنا آتی ہی نہیں اور سوائے خاموش رہنے کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ میرے سبھی رشتہ دار اس بات سے پوری طرح واقف ہیں کہ میں سو بات پر ایک بات کہنے کا عادی ہوں۔

"اسی کا نام عقلمندی ہے۔" بڑوں کا فتویٰ ہے۔

"نہیں اسے گھمنڈ کہتے ہیں۔" چھوٹوں کی سوچ۔

"عقل جب اپنے انتہا کو پہنچتی ہے، باتیں خود بخود کم ہو جاتی ہیں۔" یہ اُن دوستوں کا کہنا ہے جو زیادہ پڑھے لکھے نہیں۔ میں سبھی کی باتیں سُنتا ہوں اور مسکرا دیتا ہوں۔ کسی پر طنز نہیں کرتا بلکہ صرف اس لیے خاموش رہتا ہوں کہ خود میرے پاس میری اپنی خاموشی کا جواز ہی نہیں۔

لیکن یہ وے کیوم۔ اس کا کیا کروں؟ یہ دن بدن پھیلتا ہی جاتا ہے کبھی کبھی اس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ مجھے ساری کائنات اس کے اندر تیرتی ہوئی ایٹم لگنے لگتی ہے۔ اس سے بھی کم تر۔ کون جانے میری اس کیفیت کو کیا نام دیا گیا ہے۔

آج بارش ہو رہی ہے جس کی وجہ سے ماحول ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ لوگ اپنی بُش شرٹ اتار کر کوٹ پہن کر گھومنے لگے ہیں لیکن میرے اندر کا خلا ان چیزوں کا کوئی اثر قبول کرنے کو تیار نہیں۔ سردی ہو یا گرمی، اندر ہو یا باہر اس میں ان چیزوں سے کوئی حرکت پیدا نہیں ہو سکتی۔

جب دل اور دماغ ہی ہر طرح کے جذبے سے خالی ہو، فطرت کے یہ رنگ بے معنی سے لگنے لگتے ہیں۔ اور خلا بس وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے۔ بے حس بے حرکت اور بے جان۔

کوئی بتائے کہ وجود کا آخر مقصد کیا ہے؟ ہو سکتا ہے آپ کے اپنے وجود کے کوئی معنی ہوں لیکن میرے وجود کا مقصد؟ میں کیونکر ہوں اور کیونکر نہیں ہوں؟

ہزاروں کتابیں اور سینکڑوں فلسفے چھان لینے کے بعد بھی میں اس کا جواب نہیں پا سکا ہوں۔۔۔ میں نے دُنیا کے سبھی مذاہب اور نظریات بھی دیکھ ڈالے ہیں۔ میرا سوال جب بھی جواب طلب ہے میں کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پایا ہوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مجھے اپنا وجود، اپنا جسم اور اپنی بقا نہ صرف بے مقصد لگتی ہے بلکہ بے مصرف بھی۔ خیر سے روبوٹ کا بھی ایک مقصد ہے وہ بھی ایک خاص کام کے لیے بنایا جاتا ہے۔ وہ اپنا مقصد پورا بھی کرتا ہے۔ لیکن میں کیا ہوں۔ روبوٹ یا آدمی۔ میں یہ بھی نہ جان سکا۔

لوگ ہیں کہ اپنے آپ پر زنجیریں مسلط کئے بیٹھے ہیں۔ کاروباری زنجیریں، بیوی اور بچوں کی زنجیریں، سماج کی زنجیریں اور ان ہی زنجیروں میں جکڑے وہ گدھے کی طرح زندگی کی راہوں سے گرتے پڑتے گذر ہی جاتے ہیں اور آخر کو اپنی منزل پا لیتے ہیں۔ لیکن میرا کیا ہوگا؟ میں بھی تو ان ہی زنجیروں کا قیدی ہوں۔ میں کیوں اپنے آپ کو ان زنجیروں سے الگ پاتا ہوں۔ الگ تھلگ اور تنہا۔ ان زنجیروں سے آزاد ہو کر کوئی جی بھی سکتا ہے؟

صبح کو دفتر جاتا ہوں، شام کو واپس آتا ہوں، کھانا کھاتا ہوں، ریڈیو سُنتا ہوں اخبار پڑھتا ہوں۔ تیل، نمک اور دودھ، سبزی کا حساب رکھتا ہوں۔ انشورنس، جی پی فنڈ، انکم ٹیکس، مکان کا کرایہ، موت، پیدائش، شادی، غم۔ ان سارے جھمیلوں میں گھرنے کے باوجود بھی اپنے آپ کو الگ اس حد تک الگ تھلگ اور لاتعلق پاتا ہوں پاگل ہو جاتا ہوں۔ اور خدا کے وجود سے

منکر ہونے کے باوجود بھی کبھی کبھی میرے منہ سے نکل ہی جاتا ہے۔

"او مائی گاڈ۔"

حال ہی کا واقعہ ہے مجھے ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ رات کے وقت میں سائیکل پر سے گر پڑا۔ اُس وقت بھی میرے منہ سے یہی الفاظ نکلے "اوہ۔ مائی گاڈ" لیکن جوں ہی میں لوگوں کی مدد سے اُٹھ کھڑا ہوا، میرے دل کے اندر کوئی بھی جذبہ نہ تھا۔ نہ خوف کا نہ وسوسے کا اور نہ ہی کسی ایڈونچر کا۔ ہسپتال کے اندر جب مجھے سکریننگ پلانٹ کے آگے کھڑا کیا گیا اور ڈاکٹر میرے زخمی بازو کو ٹٹولنے لگا تو محض جسمانی تکلیف کی بناء پر میری چیخ نکل گئی۔ میرے جسم سے پسینے چھوٹنے لگے۔ ڈاکٹر نہ جانے کیا سمجھ بیٹھا۔ وہ پریشان ہو گیا اور اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ وہ سمجھا کے میرے بازو میں شدید قسم کا فریکچر ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر کی یہ پریشانی دیکھ کر میں مسکرا پڑا۔ اور وہ حیران ہو کر رہ گیا۔ اور جس وقت مجھے ایکسرے کی میز پر بیٹھنے کو کہا گیا اور میرا بازو دوبارہ کھولا گیا تو پھر ایک بار میرے منہ سے سسکاری نکلی۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ فریکچر ہے۔"

"بس۔۔۔۔" میں ہنس پڑا جس پر ڈاکٹر چڑ گیا۔

"جناب۔ آپ اسے مذاق سمجھتے ہیں۔ یہ ہڈیاں جڑنے میں کم سے کم تین مہینے لگیں گے۔"

"بس۔ صرف تین مہینے۔ چہ چہ چہ" میں مایوس ہو گیا اور ڈاکٹر میرا سر ٹٹولتا رہا۔

"کہیں آپ کے سر میں بھی چوٹ تو نہیں آئی ہے؟" میں چُپ تھا۔ وہ بیوقوف یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ سر میں اسی وقت چوٹ لگتی ہے جب اُس میں سوچنے کا مادہ موجود ہو خالی سر میں کہاں کی چوٹ اور کہاں کا زخم۔

ایکسرے فلم دیکھنے کے بعد میں اور بھی مایوس ہو گیا۔ بازوؤں کی ساری ہڈیاں ٹھیک تھیں۔ ڈاکٹر خوش تھا اور انگریزی میں بول رہا تھا۔

"یو آر وری لکی۔ تھینک یوور سٹارز۔"

"آف۔۔۔۔"

زندگی میں بس ایک بار اس بات کا موقعہ مل رہا تھا جو معمول کے چکروں سے ہٹ کر

تھا۔ لیکن بد قسمتی سے یہ بھی ہاتھ نہ لگا۔ بازو پلاسٹر میں بند، اور ہسپتال کے صاف وشفاف ماحول میں اُجلے اور گرم گرم بستر پر لیٹ جانا ہی رومان کہلاتا ہے۔ جو شاید میری قسمت میں نہیں۔ جب بھی یہ بیوقوف ڈاکٹر مجھ سے کہہ رہا ہے کہ

"ریئلی یو آر ویری لکی۔ آئی کان گریچولیٹ یو۔"

"ایڈیٹ۔ ہونہہ۔"

لوگوں کے یہاں چیزوں کی کمی پڑتی ہے۔ کسی مادی چیز کی کمی اور اسی کی تلاش میں وہ اپنی پوری زندگی ختم کر دیتے ہیں۔ لیکن میرے یہاں کسی بھی مادی چیز کی کوئی کمی نہیں۔ اگر کمی ہے تو میرے اندر کی۔ میرے دل کی جس کے اندر کوئی بھی جذبہ نہیں۔ نہ خوف کا اور نہ ہی خوشی کا۔ محبت، نفرت، غم، رومان، کوئی بھی نہیں۔

داناؤں کا کہنا ہے کہ آدمی فقط چاول اور سبزی کھانے کے لیے ہی زندہ نہیں رہتا۔ چاول، پانی اور ہوا جیسی چیزیں اس کے جسمانی نشو نما کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن جسم کے اندر بھی تو کوئی شے ہے؟ جس کی نشو نما کے لیے بھی کئی طرح کی ضروریات درکار ہیں۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک میں بھی اس بات کا قایل تھا اور اسی وجہ سے کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ افسانے لکھتا تھا اور ڈرامے کھیلتا تھا۔ گانے سُنتا تھا اور فلمیں دیکھتا تھا۔ کلب جاتا تھا۔ لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر ہنستا بولتا اور روتا تھا۔

لیکن وہ تو میرا ماضی تھا۔ ماضی کے مقابلے میں میرے حال کی چال ڈھال ہی بدل کر رہ گئی ہے یہ ساری چیزیں فضول، بے ہودہ اور بکواس لگنے لگی ہیں۔ کتابیں پڑھ پڑھ کر اب میرا دماغ خالی ہو گیا ہے۔ افسانے لکھ لکھ کر میری اپنی زندگی افسانہ پیچیدہ اور لایعنی ہو کر رہ گیا ہے۔ ڈراما محض نقل ہے جس میں سوچ کا کوئی شائبہ نہیں۔ فلمیں بے مقصد ہیں۔ کلب جانا ریاکاری ہے۔ محفلوں میں بیٹھ کر یار دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق ایک تکلیف دہ امر ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنے میں بھی کوفت ہو رہی ہے۔ نہ جانے کیوں۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں چاہتا۔ کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی میرے دل اور دماغ کا یہ وے کیوم کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ چاہتا ہوں کہ کسی طور اسے بھرا جائے۔ اور اس کے لئے چاہیے کیا؟ کسی کی محبت؟ کسی سے شفقت یا کسی کی ہمدردی؟ اور اگر یہ ساری چیزیں ہاتھ آنے کے باوجود یہ وے کیوم پُر نہ ہوا؟ تب کیا کیا جائے؟

"اُف۔۔۔۔۔"

میں اوب بھی نہیں جاتا۔ اگر اوب جاتا پھر بھی ایک جذبہ کہلایا جاتا جو میرے اندر کے خلا کو پُر کرتا۔

"اوہ مائی گاڈ۔"

دل اور دماغ کے خالی پن کا کوئی علاج بھی ہے کیا؟

بارش ہو رہی ہو گی جس سے فضا میں خنکی پھیل چکی ہو گی۔ ماحول میں خوشگوار سردی ہو گی۔ اور ایسی سردی میں لحاف اوڑھ کر بیٹھ جانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ یہ عیش کہلاتا ہے۔

لیکن وہ لوگ جو اپنی راتیں، دن کے انتظار میں کاٹنے کے عادی ہو چکے ہوں جن کی تقدیر میں فقط انتظار ہی لکھا گیا ہو۔ وہ کیا کریں؟ کہاں جائیں؟

ہائے میرا یہ وے کیوم، یہ خالی پن، کاش کسی طور پُر کیا جائے۔

غلام رسول سنتوش

سنگ مزار

پھر یوں ہوا کہ بیوی کراہی "ہائے میں مری۔"

کچن کے ساتھ لگے غُسل خانے میں نہاتے ہوئے اس نے یہ کراہ سنی اور ٹھٹھک گیا۔ یوں کہ گیلے بدن پر پھیلے سرد پانی کے قطرے بھی خشک ہونے لگے۔ مشکل سے اُس نے اپنی گردن لمبی کر کے غُسل خانے کی کھڑکی سے کمرے میں نظر دوڑائی۔ دیکھا کہ بیوی مادر زاد ننگی بستر پر اوندھی پڑی تھی۔ اُس کا لحاف الگ پڑا تھا۔ مرد نے اپنے ستر تولیا سے ڈھانپ لیا اور کمرے میں جا کر بیوی کے آگے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور بے سُدھ پڑی تھی۔ مرد حیران رہ گیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کے بدن کے ہر عضو کا جائزہ لیتا رہا۔ بیوی نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں کھول دیں اور لمبی سی آہ بھری۔ وہ اس کے پہلو میں آ کر لیٹ گیا۔ اپنے دائیں ہاتھ سے اس کا سر دباتے ہوئے بائیں ہاتھ سے سینہ مسلنے لگا۔ ایسا کرنے سے بیوی کے جسم میں تھوڑی سے حرارت آ گئی اور وہ حرکت کرنے لگی۔ بیوی کا سینہ مسلتے ہوئے اُس کے ذہن پر بیوی کی چھاتیوں کا اُبھار چھا گیا اور وہ ان سے کھیلنے لگا۔

بیوی پھر ایک بار بے ہوش ہو گئی تھی۔ اب کی بار اُسے شرارت سوجھی۔ وہ اس کے ننگے بدن کی باضابطہ مالش کرنے لگ گیا اُسے خیال تھا کہ مالش سے ہی اُس کے جسم میں حرارت جاگے گی۔ وہ مچلے گی، کسمسائے گی مچھلی کی طرح تڑپ کر آہستہ آہستہ بے سُدھ ہو جائے گی۔ اور پھر اچانک اس کی گرفت سے نکل بھاگنے کی کوشش کرے گی۔ چنانچہ وہ گھٹنوں کے بل جُھک گیا اور جھک کر بیوی کے ننگے بدن کی مالش کرنے لگا۔ اچانک ہی ننگے اور ریشم جیسے نرم اور مکھن کی طرح ملائم جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ جُھکا اور اُس کی دونوں چھاتیاں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے اُس کے ہونٹ چوسنے لگا۔

بیوی کی آنکھیں پھر ایک بار کُھل گئیں۔ اب کی بار اُس نے اپنا بدن بیوی کے بدن پر

چادر کی مانند پھیلا دیا۔ اور یوں دو بدن آگ کی بھٹی میں سلگتے رہے۔ آگ بڑھتی گئی اور بدن سُلگتے گئے۔ سُلگ کر پگھلتے گئے اور پگھل کر بس ایک نقطے پر جم گئے۔ جس طرح کائنات کی گردش اچانک تھم جاتی ہے۔ جب سب کچھ رُک جاتا ہے۔ ہر سُکھ سکون کا روپ دھارن کر لیتا ہے۔ جب سکون ہی آنند بنتا ہے۔ پُرش اور پرکرتی کا ملاپ۔ یہی وہ لمحہ ہے جسے تنتر یوگی لافانی بنا کر مُکتی پاتے ہیں۔

پھر یوں ہوا کہ آگ بُجھ گئی ٹھنڈی پڑ گئی۔ اُسے لگا کہ اُس کا اپنا بدن بیوی کے بدن سے لگ کر اچانک ٹھنڈا پڑنے لگا ہے۔ چنانچہ وہ اس سے الگ ہو گیا اور الف ننگا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ بیوی کا جسم سوکھی مچھلی کی طرح سکڑ کر رہ گیا۔

پھر یوں ہوا کہ باضابطہ بین کرنے لگا۔ اُس کی بیوی مر گئی تھی۔ اس کے یار دوست آگئے تھے۔ چنانچہ مُردے کو غُسل دیا گیا۔ کفنایا اور کاندھے پر اُٹھا کر قبرستان لے جایا گیا اور وہاں لے جا کر دفن کیا گیا۔ وہ ساری کارروائی ایک عام تماشہ بین کی طرح دیکھتا رہا۔ لیکن گھر آ کر اُسے یوں لگا کہ جیسے خود اُسی کی موت واقع ہوئی ہے اور لوگ اُسی کو دفن کر کے گھر آ گئے ہیں۔

"موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

یوں لوگ اُسے تسلی دے رہے تھے۔ سمجھا رہے تھے۔ لیکن وہ ان سبھی خیالوں سے لاتعلق کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا لوگوں کو یوں گھور رہا تھا کہ جیسے وہ سب اس کے لئے اجنبی تھے اور آج پہلی بار اس سے مل رہے تھے۔ لوگ اس کے گرد سارا سارا دن بھونروں کی طرح منڈلاتے رہے اور شام ہوتے ہی سبھی نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔

اب وہ کمرے میں اکیلا رہ گیا تھا کہ اچانک ایک دیوار سے اُس کی بیوی کا عُریاں جسم اُبھر کر باہر آ گیا۔ وہ خود بھی ننگا ہو کر بیوی کے ننگے جسم سے لپٹ گیا۔ بیوی کے جسم کے نقوش جوں جوں واضح ہوتے رہے توں توں وہ اپنا سر دیوار سے ٹکراتا گیا۔ یہاں تک کہ تھک کر نڈھال ہو گیا۔ بہت دیر بعد جب اُسے ہوش آیا تو اُسے لگا کہ اب وہ ایک اندھیری قبر میں پڑا ہے۔ اُس کی گردن اکڑ گئی ہے۔ گردن کے اکڑ جانے کی وجہ سے وہ سر بھی نہیں ہلا سکتا ہے۔ لاچار ہو کر چاروں اُور نظر دوڑائی دیکھا کہ ہر طرف اندھیرا تھا۔ قبر جیسا اندھیرا اور گھٹن۔ اُسے یقین آ گیا کہ وہ خود بھی مر گیا ہے اور قبر میں دفن ہے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر میں اُس پر قبر کا عذاب نازل ہو گا اُسے لگا کہ دیواریں چاروں اُور سے تنگ ہو رہی ہیں۔ گھبرا کر اُس نے چیخ ماری اور یوں

سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا سڑک پر آرہا۔ اُسے لگا کہ پورا مکان اُس پر گرنے لگا ہے۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر دوڑ پڑا۔

آدھی رات کا سماں تھا کہ اُس نے اپنے آپ کو بیوی کی قبر سے لپٹا ہوا پایا۔ اُس کی آنکھوں کے بند ٹوٹ گئے اور آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ وہ رودیا۔ اس قدر رودیا کہ آنسوؤں سے آس پاس کی مٹی گیلی پڑ گئی۔ مٹی نم ہوگئی اور اس کا گارا بننے لگا۔ چنانچہ گیلی مٹی کا خیال آتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ قبر کو گھور رہا تھا بالکل اسی طرح جس طرح کبھی بیوی کے ننگے جسم کو گھورا کرتا تھا۔

شام ڈھلتے ہی وہ بیوی کی قبر پر جاتا تھا۔ جا کر وہاں قبر سے لپٹ کر رودیتا تھا اور رو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا تھا۔ وہ قبر کو اسی انداز میں چومتا تھا جس انداز میں وہ کبھی بیوی کے ننگے بدن کو چوما کرتا تھا۔

ایک دن یوں ہوا کہ اُس کی نظر اپنے ہاتھوں کی طرف گئی۔ اُس نے دیکھا کہ قبر کی گیلی مٹی کی وجہ سے اُس کے ہاتھوں پر چھالے پڑ گئے ہیں۔ گھبرا کر اُس نے قمیض کے دامن سے ہاتھ صاف کئے۔ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا کہ اس کے منہ سے بھی مٹی کی باس آنے لگی ہے۔ اس نے قبر کو دیکھا۔ چاروں اُور مٹی نکھر گئی تھی۔ کہیں کہیں پتھر بھی بکھرے پڑے تھے۔ چاروں اُور نئی نئی قبریں وجود میں آگئی تھیں۔ اُسے خیال آیا کہ اُس کی بیوی کی قبر پر بھی سنگِ مزار لگنا چاہیے۔

قبرستان میں ہی ایک بوڑھے سنگتراش کا مکان بھی تھا۔ مکان کی دیوار کے ساتھ بہت سارے تراشیدہ پتھر کھڑے کئے گئے تھے۔ اُس نے یہ سارے دیکھ ڈالے لیکن ایک بھی اپنی پسند کا نہ ملا۔ بوڑھا سنگتراش مکان کے صحن میں درخت کے نیچے بیٹھا ایک بڑا سا پتھر تراش رہا تھا۔

وہ اس کے نزدیک گیا اور ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ بوڑھا سنگتراش اپنا ہتھوڑا اور چھینی چھوڑ کر چلم میں تمباکو بھرنے لگا۔ تمباکو پینے کے بعد اُس نے حقے کی نلی اُس کی طرف کر دی اور خود اپنے کام میں لگ گیا۔

"مجھے ایک سنگِ مزار بنوانا ہے۔" وہ بولا۔ لیکن بوڑھا ان سنی کر گیا۔ اُس نے اپنے مکان کی طرف گردن گھما کر زور سے کسی کو پکارا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک لڑکی ہاتھوں میں چراغ اٹھائے مکان سے برآمد ہوئی۔ لڑکی نے اَلوان کا سُرخ پھیرن پہن رکھا تھا اور چراغ کی سرخ

روشنی میں خود بھی آگ کا شعلہ لگ رہی تھی۔ لڑکی نے چراغ بوڑھے کے عقب میں ایک پتھر پر لگادیااور خود واپس مکان میں چلی گئی۔

اور جب چکریشور مندر کی گھنٹیاں آرتی پوجا کے لیے بج اُٹھیں۔ بوڑھے سنگتراش نے اپنا ہتھوڑا اور چھینی ایک طرف رکھ دیئے اور خود گریبان میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ سنگتراش کی یہ حالت دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اُسے لگا کہ پاس پڑے پتھروں کی طرح سنگتراش کا اپنا جسم بھی پتھر کا ہونے جا رہا ہے۔ ایک ایسا بھی پتھر جسے ایک دن اسی سنگتراش کے ہاتھوں تراشا جائے گا اور اس کا سنگِ مزار بنوادیا جائے گا۔

قبرستان کی خاموشی یوں بھی اماوس کے اندھیروں سے مشابہہ ہوتی ہے پتھرایا ہوا سنگتراش بھی اندھیروں کے مناظر سے خوفزدہ لگ رہا تھا۔ اُس نے مکان کو دیکھا۔ دو عدد روشن دانوں سے ہلکی سی روشنی جھلکتی نظر آرہی تھی۔ اُسے لگا کہ یہ روشندان نہ تھے بلکہ دو آنکھیں تھیں اور ساکت ہو گئی تھیں۔ مکان کی دیوار کے ساتھ کھڑے پتھر مُردے تھے جو ابھی ابھی آس پاس کی قبریں توڑ کر باہر آگئے تھے اور اب دیوار سے ٹیک لگائے آپس میں سرگوشیاں کررہے تھے۔

چکریشور مندر کی آرتی ختم ہو چکی تھی۔ گھنٹیاں بھی خاموش تھیں۔ اچانک بوڑھے سنگتراش کے جسم میں جان آئی۔ وہ پھر ایک بار اس سے مخاطب ہوا۔

"جناب مجھے قبر کے لیے ایک پتھر ترشوانا ہے۔"

"تمہیں اپنی قبر کے لیے؟" سنگتراش بولا۔

سوال سُن کر اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بوڑھے سنگتراش کی آواز گویا ایک گہرے کنویں سے آرہی تھی۔ خوفزدہ ہو کر وہ وہاں سے بھاگنے لگا لیکن جسم بہت بھاری لگا۔ بوڑھا سنگتراش چھینی اور ہتھوڑا سنبھالے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ اپنا دایاں بازو پھیلا کر اُس نے آواز کے ساتھ اُس کے قریب سے گزرا اور دور کہیں اندھیرے میں کھو گیا۔ اُسے لگا کہ اب اُس کے سانس بھی بھاری ہو رہے ہیں۔ بوڑھے نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کی بیٹی پیچھے کھڑی زور زور سے ہنس رہی تھی۔

"یہاں تو سبھی مرنے کے خاطر جیتے ہیں۔" بوڑھا کہہ رہا تھا اور آہیں بھر رہا تھا۔

"تم بھی مر جاؤ گے۔ ایک دن۔"

''جی ہاں۔۔۔۔۔''

لڑکی نے چراغ اٹھا کر بوڑھے کے آگے ایک پتھر پر رکھ دیا اور واپس اُسی جگہ چلی گئی جہاں سے چراغ اُٹھا کر لائی تھی۔

چراغ کی روشنی میں بوڑھے کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ ان آنکھوں کی تاب نہ لا کر لڑکی کی اُور دیکھنے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ لڑکی بھی اُسے گھور رہی ہے اور مسکرا رہی ہے اُسے لگا کہ لڑکی کی نظروں نے اُسے جکڑ کر رکھ دیا ہے۔ اور ان نظروں کی وجہ سے وہ اس قدر مقید ہو کر رہ گیا ہے کہ اُس کے سبھی خیال اور سوچیں معدوم ہو کر رہ گئی ہیں۔

پھر یوں ہوا کہ بیوی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد بوڑھے سنگتراش کے یہاں جانا اُس کا معمول بن گیا۔ اب اُسے نہ تو قبرستان کی خاموشی سے ڈر لگتا تھا اور نہ ہی سنگتراش کی بکواس سُن کر طبیعت اوب جاتی تھی۔ چنانچہ ایک روز جبکہ وہ سنگتراش کے یہاں بیٹھا تھا، قبرستان میں دفن ہونے کے لیے بہت سارے مُردے لائے گئے۔ بوڑھا سنگتراش بولا۔

''ایک وقت ایسا بھی تھا کہ یہاں جنگل زیادہ اور لوگ بہت کم تھے۔ رفتہ رفتہ جنگل ختم ہونے لگے۔ ان کے بدلے انسانوں کے پیڑ زمین میں اُگنے لگے، جہاں پہلے سبزہ اُگتا تھا وہاں اب ریت پھیل رہی ہے۔ اور جب جوان اور تندرست انسانوں کے لیے غذائیں نہ رہیں، وہ ایک دوسرے کو کھانے لگے۔ ان ہی فکروں میں غلطاں بوڑھے سنگ تراش کے ہاتھوں سے اس کے اوزار گر گئے۔ کہنے کو تو اس کی آنکھیں کُھلی تھیں لیکن جانے کن اطراف کو دیکھ رہی تھیں۔ لوگ لاشیں دفنا کر چلے بھی گئے تھے۔ چاروں اُور خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ جیسے خواب سے جاگ اُٹھا اور چاروں اُور دیکھنے لگا۔

''اب تو یہ ساری زمین قبروں سے بھر گئی۔ اتنی ساری قبروں میں تم اپنی بیوی کی قبر ڈھونڈ سکتے ہو؟'' سنگتراش بولا۔

''یہی تو بات ہے اور اسی لئے تو میں اپنی بیوی کی قبر پر ایک تراشیدہ پتھر رکھنا چاہتا ہوں۔''

''اگر انسانوں کے نام نہ ہوتے۔۔۔ لیکن وہ نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ اور تھوڑی دیر بعد ہی جیسے اُس نے اپنے سوال کا جواب پالیا اور بولا۔

''مان لو یہ دُنیا ایک بھٹی ہے۔ اور دنیا میں رہنے والے سبھی انسان خام مٹی کے برتن

جن کو دنیا کی بھٹی میں ٹھونس کر پکایا جاتا ہے۔ ہر لمحے ان کی ہیئت بدلتی رہتی ہے۔ بہت کم ایسے ہیں جو اپنی بھٹی سے نکلنے پر اپنی اصلی ہیئت برقرار رکھ پاتے ہیں۔ ورنہ اکثریت اُن ہی لوگوں کی ہے جو بالکل بدل جاتے ہیں۔ بہت سارے ٹوٹ پھوٹ کر بکھر بھی جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر چُپ رہا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"تم کسی کاتب سے اپنی بیوی کا نام اور تاریخِ وفات لکھوا کر لے آنا۔"

ذرا ہی دیر بعد وہ اُٹھ کر وہاں سے چلا آیا۔ مکان کے آگے جونہی گذرنے لگا، دیکھا کہ کھڑکی میں کھڑی سنگ تراش کی بیٹی دونوں ہاتھوں میں اپنا سر لئے باہر آسمان میں گھور رہی ہے۔ وہ رُک گیا اور جوتے کی نوک سے پاس پڑے پتھر کے ٹکڑوں سے کھیلنے لگا۔ پتھر کے ٹکڑوں کے ہلنے سے آوازیں پیدا ہونے لگی تھیں جو لڑکی کے کانوں تک گئیں۔ لڑکی اُسے دیکھنے لگی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ لیکن لڑکی نے فوراً اپنی نظریں ہٹالیں لیکن اس کی نظریں چند لمحوں کے لیے ہوا ہی میں معلق رہیں۔ تب کہیں جا کر اُسے ہوش آیا اور آگے بڑھ گیا۔ اُسے یقین تھا کہ لڑکی کی نظریں اب بھی اُس کا پیچھا کر رہی ہیں۔ لیکن قبرستان سے باہر آکر جب اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سوائے اندھیرے کے وہاں کچھ بھی نہ پایا۔

پھر یوں ہوا کہ رات کے اندھیرے میں جب وہ دراز قد چناروں سے پرے ہر موکھ کی چوٹیوں کو دیکھنے لگا تھا۔ اُس کے تصور میں قبرستان کی خاموشی اور سنگتراش کا آنگن جاگزیں ہونے لگتا تھا۔ چراغ کی روشنی میں اُس سارے منظر پر پریوں کے دیس کا گمان ہونے لگتا تھا جہاں دیو زاد رہا کرتے تھے۔ دور کھڑا ہاری پربت کا قلعہ خطرناک دیو اور سنگ تراش کی بیٹی ایک خوبصورت پری۔ جو آدم زاد کے فراق میں سرگرداں تھی۔ خود سنگتراش طلسماتی کہانیوں کا راوی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی ہر بات میں اب طلسماتی کہانیوں کا سا لطف آنے لگا تھا۔ وہ اس کی باتیں بڑی دل چسپی سے سُنتا تھا۔

"یوں کی تیری بیوی جوان تھی۔" سنگ تراش کہتا "پر موت تو کسی کی عمر دیکھ کر آتی نہیں۔ تمہیں اپنی بیوی سے پیار ہو گا ہی۔ کیوں نہ ہو۔ پیار تو سبھی کو ہوتا ہے۔ بیوی کو جسم کا ہی انگ کہتے ہیں۔ آدمی کے ہر عضو سے محبت ہو جاتی ہے۔" اچانک اس کی آواز بھاری ہو جاتی اور کہتا۔

"پر اس دنیا کے ہر باسی کو صرف اپنے ہی وجود سے محبت کرتے پایا گیا ہے۔" لیکن

سنگتراش کی یہ تاویل اُسے پسند نہ تھی وہ سوچتا کہ چلا کر سنگ تراش سے کہہ دے گا "کہ یہ دیکھ میرا دل۔ اس کی ہر دھڑکن میں بس اُسی کا نام سنائی دے گا۔" میری ہر سانس میں اُسی کی خوشبو رچ بس گئی ہے اور میرے جسم کے ہر حصے میں اُسی کے لمس کا احساس ابھی تک موجود ہے۔"

تب یوں ہوا کہ ایک رات فضا میں اُس کی بیوی کا آکار اُبھرنے لگا۔ یہ آکار اُس کے عریاں بدن میں ڈھل گیا۔ اور ڈھل کر سنگتراش کے عین اوپر فضا میں معلق ہو گیا۔ وہ اس کو پکڑنا چاہتا تھا کہ آکار ہوا میں چلتا ہوا مکان میں داخل ہوا۔ وہ بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

ہاری پربت کے عقب میں چکریشور مندر کی گھنٹیاں آرتی پوجا کے لیے بجنے لگیں اور سنگتراش گریباں میں سر دے کر چپ ہو گیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے مکان کی کھڑکی کو تکنے لگا۔ بیوی کا آکار مکان سے نکل کر سنگتراش کے قریب آ گیا اور اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں چراغ تھا۔ اُس کا دل چاہا کہ لپک کر اس سایے کو پکڑے گا۔ ابھی وہ اُٹھ ہی رہا تھا کہ گھنٹیاں خاموش ہو گئیں۔ اور بوڑھے سنگتراش کے بدن میں جان آ گئی۔

بیوی کا سایہ اب سنگتراش کی آکار میں ڈھل رہا تھا۔ اب بیوی کی جگہ وہ سنگتراش کی بیٹی کھڑی تھی اور اس کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ بوڑھا سنگتراش ان ساری فکروں سے آزاد سامنے رکھے بڑے سے پتھر کو رگڑ رگڑ کر چمکا رہا تھا۔

"ایک عرصہ گذرا ہے جب سے میں یہ پتھر رگڑ رہا ہوں۔ اپنے ہاتھوں سے میں نے اپنی بیوی کا سنگِ مزار بھی بنایا ہے اور ان ہی ہاتھوں نے میرے کڑیل جوان بیٹوں کے سنگِ مزار بھی سجائے ہیں۔" وہ اپنے ہاتھ دیکھ کر مُسکرا، لگتا تھا کہ یہ بھی پتھر کا تراشیدہ کوئی سنگِ مزار ہے۔

"میں نے کئی بار سوچا کہ اپنے لئے بھی ایک سنگِ مزار تیار کروں۔ لیکن ہر بار یہ لڑکی میری سوچ پر چھا جاتی ہے۔ مجھے ایسا کرنے سے روکتی ہے۔"

بوڑھے کی بات پر لڑکی نے آنسو بہانا شروع کر دئے۔ اُس کا جی چاہا کہ لپک کر اُس کے سارے آنسو پی جائے۔ لیکن ایسا کرنے کی اُس میں ہمت نہ تھی۔ چنانچہ لڑکی نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ لئے۔ بوڑھا سنگتراش کانگڑی میں ہاتھ ڈالے اُس کی راکھ میں چنگاری تلاش کر رہا تھا۔ کانگڑی میں سے چنگاری اٹھا کر اُس نے چلم میں ڈال کر حقے کے دو تین کش لئے اور نَلی اُس کی طرف کر دی۔

"تم کبھی مندر گئے ہو۔" لیکن پھر اُسے خیال آیا اور خود ہی بول پڑا۔

"تم تو مسلمان ہو۔ تم مسجد میں جاتے ہو گے۔ ہندو مندر جاتے ہیں اور مسلمان مسجد میں لیکن سوال یہ ہے کہ انسان کہاں جائے گا۔" تھوڑی دیر تک وہ اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن کوئی بھی جواب نہ پاکر خود ہی بول پڑا۔

"ایک سنیاسی تھا۔ بڑا ہی پرہیز گار۔ ساری عمر اُس نے مندر کی تعمیر کرائے۔ ہر مندر میں مورتیاں نصب کرادیں۔ لیکن مرنے سے قبل جو مندر بنوایا اُس میں مورتی کی جگہ آئینہ رکھ دیا۔"

تب سنگتراش اونگھنے لگا اور وہ اس کی اس بات پر غور کرنے لگا۔ کافی غور وخوض کے بعد بھی وہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا اور ایک جھٹکے میں سارے خیالات اپنے دماغ سے نکال دئے۔

لڑکی بھی تھک چکی تھی اور جماہیاں لے رہی تھی۔ وہ لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن انگڑائی لیتے وقت جونہی لڑکی کی نظر اُس پر پڑی، وہ اُلجھ کر رہ گئی۔

بوڑھا سنگ تراش کہہ رہا تھا۔ "ہماری اس دنیا میں ہر شخص کو فقط اپنے ہی وجود سے محبت ہوتی ہے۔" اور اگلی صبح اُس نے نیند سے بیدار ہوتے ہی بیوی کی تصویر دیکھنے کی بجائے آئینے میں اپنی شکل دیکھنا شروع کردی۔ لیکن لاکھ دیکھنے پر بھی وہ یہ نہ جان سکا کہ اُسے اپنے ہی وجود سے پیار ہے۔ چنانچہ آنکھیں بند کرلیں اور بند آنکھوں میں ایک دم بیوی کا عریاں بدن عود کر آیا۔ خیالوں ہی میں اس ننگے بدن کو چومنا چاہا کہ منہ میں مٹی کی باس اُبھری۔ اُسے یاد آیا کہ بیوی اب تک منوس مٹی کے نیچے دب کر خود بھی مٹی سے مل گئی ہوگی۔ آنکھیں کھول کر آئینے کو دیکھا تو وہاں سنگتراش کی بیٹی کا چہرہ جھیل میں کھلے ہوئے تازہ کنول کی طرح لگا۔ جس پر تازہ بہار کا جوبن چھایا ہوا تھا، جس کے چہرے سے کارتک پورنماشی کے چاند کا سا خمار ٹپک رہا تھا۔ اُس کی نس نس میں مستی چھاگئی اور وہ آئینے کو چومنے لگا۔ لیکن اُس کے سانس چھوڑنے سے آئینہ دُھندلا گیا۔ چنانچہ ایک دم سینے سے رگڑ کر اسے صاف کردیا۔ اب کی بار جب اُس نے آئینہ دیکھا تو وہاں سنگتراش کا چہرہ اُبھر آیا۔ اُس نے اٹھا کر آئینے کو ہی فرش پر دے مارا۔ آئینہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ شیشے کی کرچیاں دور تک پھیل گئیں۔ لیکن آئینہ ٹوٹ کر بھی آئینہ ہی رہتا ہے۔ ہر کرچی میں اُسے سنگتراش ہی کی شبیہہ دکھائی دی۔ جس کے سنجیدہ چہرے پر تھوڑی سی مسکراہٹ بھی چھاگئی تھی۔

"دنیا میں ہر شخص کو صرف اپنے وجود سے غرض ہوتی ہے، بوڑھے کی یہ بات سارا دن اُس کا پیچھا کرتی رہی۔ کانوں میں رس گھولتی رہی اور جب شام کو وہاں گیا تو بوڑھے

سنگ تراش کو چپٹی چھینی ہاتھ میں لئے پتھر کو صاف کرتے دیکھ لیا۔ وہ جا کر لڑکی کے برابر میں بیٹھ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے پاس بیٹھنے سے لڑکی تھوڑی بے چین ہو رہی ہے۔ شاید یہ مچھلی اُس کے ہاتھوں سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کاش کہ کوئی جال مل جائے جس میں وہ اس مچھلی کو جکڑ کر باندھ سکے۔ ایک انگڑائی لیتا ہوا وہ کھڑا ہو گیا اور دونوں بازو پھیلا کر ان کا ایک دائرہ سا بنا لیا اور رفتہ رفتہ دائرہ تنگ کرتا گیا۔ جیسے اس دائرے کے اندر اُس نے سنگتراش کی بیٹی کے عریاں وجود کو جکڑ رکھا تھا اور وہ اس حلقے سے نکل بھاگنے کے لیے مچل رہی تھی۔

اس کی یہ حرکت دیکھ کر سنگتراش کی بیٹی شرما گئی لیکن بڈھا اپنی بیٹی کی حرکتیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ حقے کی نلی اُس کے منہ میں پھنس گئی اور ذہن جانے کن سوچوں میں کھو گیا۔ اس کا چہرہ بار بار رنگ بدلتا گیا۔ اور حقے کی نلی جھٹ سے اُس کے دانتوں سے نکل گئی۔ وہ جیسے نیند سے جاگ پڑا۔ گھورتی ہوئی نظروں سے اُس نے پہلے اپنی بیٹی کو دیکھا اور پھر اس کو۔ لڑکی باپ کی نظروں کا تاب نہ لا کر اپنی جگہ سے اُٹھ کر مکان میں چلی گئی۔ لیکن جلد ہی ہاتھوں میں چراغ اٹھانے واپس آ گئی۔ سنگتراش اب ٹاٹ کے ٹکڑے سے پتھر کو رگڑ رہا تھا۔ "جانتے ہو، میں کب سے یہ پتھر تراش رہا ہوں۔" بڈھا سنگتراش بولا۔

"ہاں۔ جب سے میں یہاں آ رہا ہوں۔" اُس نے محض جواب دینے کی رسم پوری کرتے ہوئے یہ بات کہہ دی ورنہ اسے اس بات میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"نہیں۔ اُس سے بھی بہت پہلے۔ شاید اُسی دن سے جب میں پہلی بار ہاتھ میں یہ ہتھوڑا سنبھالنا سیکھ گیا تھا۔"

چکریشور مندر کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ بڈھا پھر ایک بار گریبان میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اُس نے دیکھا کہ لڑکی کے چہرے پر لالی سی چھا گئی ہے۔ اُسے یاد آیا کہ اسی قسم کی لالی اُس کی بیوی پر بھی چھا جاتی تھی، جب وہ اُس کے عریاں بدن پر مالش کرنا شروع کر دیتا تھا یا اُس کی چھاتیوں سے کھیلتا تھا۔ آرتی کی گھنٹیاں چپ ہو گئیں اور سنگتراش نے بھی سر اُٹھا کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"آدمی بھی عجیب ہے۔" سنگتراش بولا۔ "وہ اپنا ماضی بھول جاتا ہے اور مستقبل کی اُسے فکر نہیں۔ فقط حال کے گرداب میں پھنسا بس اپنے ہی وجود کے گرد گھومتا رہتا ہے۔" اُس کی نظریں سنگتراش کو دیکھ رہی تھیں لیکن ذہن سنگتراش کی بیٹی کے جسم میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ اسے کبھی بانہوں میں اٹھا لیتا تھا اور کبھی چومتا رہتا تھا۔ اُس کے کان بوڑھے کی اُور لگے تھے لیکن

آواز وہ کہیں اور سے سُن رہا تھا۔ ماضی کے تمام تر خیالات و واقعات ذہن سے بوسیدہ قبروں کی طرح مٹتی چلی جارہی تھیں۔ مستقبل کی اُسے فکر نہ تھی، بس حال میں مست بڈھے کی بیٹی کے گرد طواف کرنے میں لگا تھا۔

لڑکی اُٹھی اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے مکان کے اندر چلی گئی۔ بڈھا بڑے پیار سے نوتراشیدہ پتھر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ جیسے کوئی نوزائیدہ بچے کو چمکار رہا ہو۔

"انسان بذات خود ہی اپنی قبر کا پتھر بھی ہے جس پر اُس کا نام اور تاریخِ وفات پہلے سے ہی کندہ کی گئی ہے۔" یہ پتھر تمہیں کیسا لگا؟

"اچھا ہے" وہ بے غرضی سے بول پڑا۔ بڈھے کے ہاتھ حرکت میں تھے لیکن آنکھیں دور کہیں جھاڑیوں میں پھنس گئی تھیں۔ اُس کے چہرے کی جھریاں کبھی پھیلنے اور کبھی سکڑنے لگی تھیں۔ چنانچہ سنگتراش سے کچھ کہے بغیر ہی وہ وہاں سے اٹھ گیا۔ مکان کے نزدیک آتے ہی اُس نے لڑکی کو اپنے انتظار میں دیکھا۔ وہ اس کے نزدیک گیا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور دونوں ایک دوسرے پر واری ہونے لگے۔ پھر یوں ہوا کہ وہ بڈھے سے اوب گیا۔ بڑی بے دلی سے اُس کے پاس بیٹھتا تھا۔ اب اُس مرحوم بیوی سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نہ اُس کی یادوں سے کوئی لگاؤ۔ اُس کی تمام تر توجہ اب بڈھے کی بیٹی کی اُور مرکوز تھی۔ مندر کی گھنٹیاں بجتے ہی وہ اُس کے مکان میں آدھمکتا تھا۔ عاشق و مشوق کی چاہتیں اب ایک ہی نقطے پر آکر سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ایک نقطہ پھیل کر دائرے میں بدل جاتا ہے اور دائر سمٹ کر ایک ہی نقطے پر آکر جم جاتا ہے۔ نقطہ یہاں بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ محض آوازوں کا بے ہنگم شور بس دل کی دھڑکنیں رہ جاتی ہیں یا ان کا زیروبم۔ انگ انگ میں مستی و مدہوشی چھا جاتی ہے جسم آگ میں جھلنے لگتے ہیں، پگھل جاتے ہیں اور ضم ہو جاتے ہیں۔ دو بدن ایک ہی وجود میں ڈھل جاتے ہیں۔ پُرش اور پرکرتی کا ملاپ ہوتا ہے۔ اسی کا نام آنند ہے۔

پھر یوں ہوا کہ بڈھے نے اُس کی بیوی کی قبر تلاش کرنا چاہی۔ لیکن وہ نہ ملی۔ تھک ہار کر اُس نے تلاش ہی ختم کر دی۔ وہ اُسے بھول چُکا تھا۔

تب یوں ہوا کہ سنگتراش کراہا "میں مر رہا ہوں۔"

مکان کے اندر بڈھے سنگتراش کی بیٹی اکیلی اپنے باپ کی میت پر بین کر رہی تھی اور وہ باہر کھڑا اُس پتھر کو دیکھ رہا تھا جو اصل میں اُس کی بیوی کی قبر کے لیے تراشا گیا تھا۔ لیکن سنگتراش نے اسی پر اپنا نام اور تاریخِ وفات ڈال دی تھی۔

غلام بنی بابا

زہر

گورکن لالٹین کی دھیمی روشنی مُردے کو قبر کے اندر لے جارہا تھا۔ مُردے کے کفن سے سیاہی مائل خون باہر آرہا تھا اور قبرستان کے ایک کونے سے دبی دبی سسکیاں اُبھر رہی تھیں۔

رات کی خاموشی میں اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

گولی چلنے کی آواز۔۔۔

"کس نے ماردی؟"

"کس کو لگی؟"

میں نے جانا

کسی کی آہ جیسے دل میں پیوست ہو کر رہ گئی ہے۔

تھوڑا سکوت

ادھر سے گیدڑ کے رونے کی آواز

پھر ایک بار خاموشی اور وہی غمزدہ ماحول

یہاں اس جھونپڑی میں ایک چراغ ٹمٹمارہا ہے، کسی بُڑھیا کی مسلسل کھانسنے کی آواز اُبھری۔ اور اُدھر ایک طرف سے کسی کی ڈولی سُسرال کو روانہ کردی گئی۔

بیٹی مت رو۔ مت رو کہ میکے کو آخر کار خیرباد کہنا ہی ہوتا ہے۔

گورکن اپنے پیلے دانت اور سپاٹ چہرہ اُٹھائے میری اُور للچائی نظروں سے گھور رہا ہے۔ اس کی عادت ہے کہ یہ زندوں کو پُرہوس نگاہوں سے گھورتا رہتا ہے اور آس پاس کے بیماروں سے زبانی ہمدردی جتاتا رہتا ہے۔ جانے کیوں آج لحد کے اندر دراز کئے گئے مُردے کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ لگتا ہے اسے بھی ابھی تک اس بات کا یقین نہیں ہے کہ نسرین مرگئی

ہے۔۔۔یہ کفن چور، شاید کوئی ترکیب سوچ رہا ہے۔
اچانک ہی کتا بھونک اُٹھا اور میں ڈر گیا۔ بھوبھو، کتے کی بھونک اس قدر زوردار تھی کہ اسے کتے کا رونا بھی کہہ سکتے ہیں۔ سُنا ہے کتے جبھی روتے ہیں جب زمین پر بلائیں نازل ہو جاتی ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے اس کل یگ میں آسمانی بلائیں تسبیح کے دانوں کی طرح نازل ہوتی رہیں گی۔ جن کا نہ اگلا ہو گا نہ پچھلا۔ نہ سر نہ پیر۔ سچ ہے۔ نہ اگلا، نہ پچھلا۔ نہ سر، نہ پیر
اُس عورت کا وہ ادھ کھلا گلاب سڑک پر دوڑتی ہوئی فوجی گاڑی کے نیچے آ گیا، جس فوجی گاڑی کا نہ اگلا تھا نہ پچھلا۔ بچے کے ہاتھوں پڑی تیلڑی اور ڈھائی آنے سکے۔ اُس کی بند مٹھی سے نکل کر سڑک پر دور تک جا گرے۔
ہائے میرے لال۔
افواہ گرم ہے کہ گولیوں سے چھلنی کسی کی لاش وہاں دلدل میں پڑی ہے۔
"اُف۔۔۔۔"
مشرقی پاکستان میں ہزاروں لوگ سمندری طوفان میں بہہ گئے ہیں۔
ویت نام ایک جھلستی بھٹی کا نام ہے کہ جس کے اندر آدم کی اولاد کو بطور ایندھن ڈالا جاتا ہے۔ بم، ایک کے بعد دوسرا بم۔ اور جب کبھی ہیروشیما یا ناگاساکی کی یاد آتی ہے، پورے جسم پر پگھلتا ہوا سیسہ گرنے لگتا ہے۔ ہڈیوں سے گوشت اترنے لگتے ہیں اور کانوں میں صورِ اسرافیل گونجنے لگتا ہے۔ آگ کی لپٹیں منہ پر آجاتی ہیں۔
سُنا ہے آگ اپنے آپ کبھی نہیں لگتی۔ آگ جنوں کے ماتحت ہوتی ہے۔ چونکہ جن ناری ہیں، اس لئے ہر روپ دھارنے پر قادر ہیں۔ ابھی ایک شکل میں اور ابھی دوسری صورت میں۔ کتے کی شکل یا بلی کی صورت میں۔ اور کبھی آدمی کے روپ میں بھی آتے رہتے ہیں۔ اصل میں یہ بزدل ہیں اسی لئے اپنا روپ بدل لیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ اپنے اصلی روپ میں آجائیں، ضرور ان پر انسان کا سایہ ہو گا۔ اور جب کبھی ان پر آدمی کا آسیب نازل ہوتا ہے، ہرگز پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اور آدمی کا سایہ پڑنے سے قبل یہ گھروں کے گھر تباہ کر دیتے ہیں۔ محل ڈھا دیتے ہیں۔ دلوں میں وسوسہ اور خوف ڈالتے ہیں۔ اور کتنے ہی بالغ اور نابالغ لڑکیوں اور لڑکوں کی گردنیں مروڑ کر رکھ دیتے ہیں۔
مجھے اپنے محلے کے بزرگوں کی یہ بات صحیح لگتی ہے کہ ان ہی کی وجہ سے ہمارے گھر

کو بھی آگ لگی ہے۔ ہمارے یہاں کے سبھی عامل اس بات سے پوری طرف واقف تھے کہ جن آگ لگادیں گے۔ بس وہی لوگ اس کے ذمے دار ہیں۔ ہمیں خاک پر بٹھادیا۔ اس آگ کی وجہ سے ہماری ساکھ ہی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ پھر بھی ہم ڈھیٹ ہیں کہ جی رہے ہیں۔ ورنہ دیکھا جائے اس آگ ہی کی وجہ سے میرا بھائی مجھ سے دور ہو گیا ہے۔

بھائی ہی بھائی کا دشمن بن گیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی جان کے پیچھے پڑے ہیں۔ بہار، احمد آباد، راور کیلا، مہاراشٹر۔۔ انسان ذلیل ہورہا ہے۔ انسانیت رو رہی ہے۔ لو دیکھو۔ یہ شخص آدمی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگتا ہوا آرہا ہے۔ کیا یہ آدمی ہی ہے کیا یہ ہندو ہے یا مسلمان ؟ یہ سکھ ہے یا عیسائی؟

ایک بھونچال آیا ہے۔ زمین دھنس رہی ہے۔ جانے کیا ہو رہا ہے۔ "میں خود کو غور سے دیکھنے لگا ہوں۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ جانے کیوں میرا سر چکرا رہا ہے۔" قبر میں گرنے ہی لگا تھا کسی نے مجھے تھام لیا ہے۔ اُف۔ اس کی یہ زہر بھری مسکراہٹ۔ یہ گورکن ہی ہے۔

چڑھتی جوانی، کھلتا ہوا چہرہ، موہنی صورت، گلاب کی کلی، مل دید، اس کی ریشم جیسی زلفیں قبر میں سڑنے کے لیے جارہی ہیں۔ میرا کلیجہ پھٹا جارہا ہے۔

کفن کے اندر خون میں نہایا اس کا ماہتاب سا چہرہ۔ بھلا کون یقین کرے گا کہ یہ مر گئی ہے۔ ابھی تو اس نے اپنے باپ کی موت کا صدمہ اٹھانا تھا۔ ایک جھٹکے میں مر گئی، اور جب اس نے زندگی کی ایک بھی صبح نہ دیکھی۔ کپڑوے اندر رکھی کانگڑی میں پڑی آگ سے اس کا سینہ جھلس گیا تھا اور اس کا یہ جھلسنا اس کی موت سے بھی بدتر تھا۔ مرنے سے پہلے اُسے نسرین کی شادی کی فکر کھائے جارہی تھی۔ اور اگر وہ آج بیٹی کی ڈولی کے بجائے اُس کا جنازہ دیکھ لیتا تو سچ مچ پاگل ہو جاتا۔ خاص طور سے جب اُس کی لاش ہسپتال کی ایمبولینس میں لائی جارہی تھی۔

ہر طرف شور برپا ہے۔ نسرین کی سہیلی فہمیدہ بین کر رہی ہے۔

نسرین۔ میں تیری مہندی لگے ہاتھوں کی واری۔

نسرین۔ میں تیرے سرو قد کے قربان۔

نسرین۔ اُف تیرا جسم اس قدر پھول گیا ہے۔

نسرین۔ اب میرا کون رازدار بنے گا۔ میں کس کے ساتھ اپنا دُکھ بانٹوں۔

لوگوں کا تانتا بندھ گیا ہے۔ ہر طرف سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔

"کیا؟۔۔ نسرین مر گئی ہے؟"

ایک طرف سے کسی نے لفظ زہر بول دیا۔ جسے سُن کر میں ششدر رہ گیا۔ بات بڑھتی گئی۔ نسرین کا اپنی ہی قوم کے کسی فرد سے لگاؤ تھا۔ لیکن اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کسی بیوپاری کے یہاں ٹھہرائی گئی تھی۔ تب سے وہ بُجھ کے رہ گئی تھی۔ وہ نہ تو بناؤ سنگھار کرتی تھی اور نہ ہی کسی سے بولتی تھی۔ بس چڑچڑی ہو گئی تھی۔ بات بات پر کاٹ کھانے کو آجاتی تھی۔

میں بولا۔ "نسرین۔ میری طرف دیکھ۔ کچھ تو بول دے۔ تیرے ابا مر گئے ہیں۔ پر ہم تو نہیں۔ تیرا رنگ پیلا کیوں پڑ رہا ہے۔ نسرین۔ نسرین، نادان لڑکی، کوئی اتنی بھی ہمت ہار جاتا ہے کیا؟ چل میرے ساتھ۔ سیر کو چلتے ہیں۔ کئی طرح کے لوگ مل جائیں گے۔ تب جا کر دیکھیں گے کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"نسرین! شاباش بیٹی اب اُٹھ بھی جا۔ ہاں بیٹی شاباش۔"

غلام نبی شاکر

پھسڈی

اس نے ٹانگہ اسٹینڈ کی جانب نظر دوڑائی۔ دیکھا تو وہاں آدم تھے نہ آدم زاد۔ دور ایک کونے میں ایک نیا اور چمکتا ہوا ٹانگہ گھوڑا کھولے بے کار پڑا تھا۔ اسٹینڈ میں ہر جانب گھاس بکھری پڑی تھی جو سڑ رہی تھی۔ اس کے علاوہ گھوڑوں کی لید تھی جس سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ بازار ابھی بند تھے کیونکہ بہت کم روشنی ہوئی تھی۔ ایک لمبا سا سانس لے کر اُس نے پھر ایک بار گھوڑے کی لگام کھینچی۔ گھوڑا دھیمی رفتار سے اسٹینڈ کی جانب چل دیا۔ تھوڑی دیر تک اُس نے ٹانگہ اسٹینڈ کے آگے روک لیا، اور وہاں اسٹینڈ خالی دیکھ کر واپس لوٹ گیا۔ اور ہوٹل کے سامنے رُک گیا۔ وہ ٹانگے سے اُتر آیا۔ گھوڑے کو تھپتھپی دی۔ کمر تھپتھپا کر اُس کی زین کس لی۔ اور سبھی ڈوریاں اچھی طرح باندھ لیں۔ اچانک اُس کی نظر پائیدان میں لگے بولٹ پر پڑیں۔ بولٹ ڈھیلا پڑ گیا تھا اور گرنے کو تیار تھا۔ اُس نے اسے خالی ہاتھوں سے کسنے کی کوشش کی لیکن بولٹ میں زنگ لگ گیا تھا۔ کھڑے ہو کر اُس نے ٹانگے کی پیچھے والی سیٹ ہٹالی۔ سیٹ ہٹاتے ہی وہاں سے دھول کا بھپکا اُٹھا۔ اور اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ پھر بھی اُس نے ہاتھ بڑھا کر سیٹ کے نیچے سے پُرانے قسم کے اوزار نکال لئے اور اسی کی مدد سے بولٹ کسنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ گھوڑے کی پیٹھ کو بھی برابر تھپتھپا رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ہوٹل میں ضرور کوئی شخص ہو گا جسے کہیں جانا ہو گا۔ لیکن کافی دیر انتظار کے باوجود کوئی سواری نہ ملی۔ بڑی بے دلی سے اُس نے ڈبل جین کی واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نسوار کی ڈبیا نکال لی۔ چٹکی بھر نسوار اُس نے اپنے جبڑوں پر لگائی اور جھٹ سے ٹانگے میں بیٹھ گیا۔ گھوڑے کو چابک مار کر بڑی تیزی سے ٹانگہ اسٹینڈ کی جانب بڑھا۔ منہ بند تھا اور نسوار کا نشہ نس نس میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں دانتوں کی ٹیس کم ہونے لگی اُس نے موٹا سا تھوک دائیں پہنیے کے بوٹ پر یوں گرا دیا جیسے لوگ الصباح گریز ڈال دیا کرتے ہیں۔

پورا بازار چھان کر وہ واپس اسٹینڈ پر آ کر رُک گیا تھا اور اب روشنی بھی ہونے لگی تھی۔ سکندر کے ہوٹل میں سے برتن کھنکھٹائے جانے کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ برتن بجنے کے ساتھ چائے والی خوشبو پھیل گئی اور منہ میں پانی بھر آیا۔ ساتھ ہی وہ سات روپے یاد آ گئے جو ہوٹل والے کو دینے تھے اور جن کے دینے کا اُس نے وعدہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ چائے کی خوشبو اپنے ذہن سے جھٹک کر وہ پھر ایک بار سواری کی تلاش میں نکل پڑا۔ سٹینڈ میں ابھی تک وہی ایک خالی ٹانگہ تھا اور بے کار پڑا تھا۔

اسے زندگی بھر اسٹینڈ سے نفرت رہی تھی۔ اس کی طرف ایک نظر دیکھنا بھی اسے گوارہ نہ تھا۔ اس کی دانست میں اسٹینڈ ایک بلائے ناگہانی تھی جس کے ہوتے ہوئے وہ الجھ کر رہ گیا تھا۔ اگر یہ عمارت ہوتی، کب کا اسے آگ کی نظر کر گیا ہوتا۔ چاہے اس کام کے لیے، اُسے پتھر کا جگر بھی کہیں سے خرید کر لانا پڑتا۔ آگ لگا کر وہ اس کا نظارہ دیکھنے لگ جاتا اور جلنے کا منظر دیکھ کر خوش ہو لیتا۔ شاید اسی طرح اس کے اندر کا زہر زائل ہو جاتا۔ وہ زہر جو اس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا۔ یہ زہر اُس کی رگ رگ میں جبھی سے دوڑ رہا تھا جب اس اسٹینڈ کی بُنیاد رکھی گئی تھی۔ ٹانگہ اسٹینڈ کسی عمارت کا نام نہ تھا۔ بس دو کنال زمین تھی کہ جس کی وجہ سے اُس کا کاروبار پوری طرح تباہ ہو گیا تھا۔ وہ صبح و شام اس اسٹینڈ کو کوستا رہتا۔ اس امید میں کہ شاید اُس کی بد دعا اس اسٹینڈ کو ہی لے ڈوبے۔

اس نے اپنا ٹانگہ اسٹینڈ کی جانب موڑ لیا تھا۔ گھوڑے کی لگام اس قدر ڈھیلی چھوڑ رکھی تھی کہ جانور اپنی انکل کے سہارے کشاں کشاں آگے بڑھ رہا تھا۔ اور کبیر ٹانگہ بان خود سے سوچ رہا تھا کہ اسٹینڈ ہر کسی کی بھی اجارہ داری نہیں۔ یہ اسٹینڈ سبھی ٹانگے والوں کی مشترکہ میراث ہے۔ البتہ یہ سوچتے ہوئے بھی وہ عجیب سی الجھن میں تھا اور آج پہلی بار اسٹینڈ کے اندر لے جانا اُسے بُرا لگ رہا تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ کبیر ٹانگہ بان کو اپنے آپ پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ جب سے ٹانگہ چلایا کرتا تھا جب سری نگر سے بانڈی پور تک ہفتے میں صرف ایک بار بس چلتی تھی۔ اس میں پانچ یا چھ مسافر بیٹھتے تھے اور وہ بھی کئی کئی دنوں تک گلی گلی ڈھول بجا کر جمع کیے جاتے تھے کہ "فلاں وقت میں فلاں جگہ سے سری نگر والی بس روانہ ہو گی۔" اس زمانے میں پشاوری طرز کے ٹانگے میں یارقندی نسل کا گھوڑا جوتا جاتا تھا۔ اسٹینڈ نام کی کسی بھی چیز کا وجود تک نہ تھا اور نہ کسی جگہ جانے یا

واپس آنے کا ریٹ مقرر تھا۔ کبیر ٹانگے والا اپنی مرضی کے وصولتا تھا۔ کوئی پوچھنے والا بھی نہ تھا اور ایسے میں خود اپنی مرضی کا مالک تھا۔ کبیر ٹانگے والا خود ہی میر بھی تھا اور خود ہی پھسڈی۔ ایک اور بات بھی تھی جو اسے اب تک یاد تھی۔ گلگت، یارقند اور چلاس کے لیے سری نگر کے سبھی راستے کھلے تھے۔ اُدھر کے بیوپاری زیرہ، کاجو اور چیری لے کر بانڈی پور آتے تھے۔ اس قدر امیر تھے وہ لوگ کہ مہنگے کرایے کی انہیں فکر نہ تھی۔ کبیر ان کی خوب خبر لیتا تھا۔ من چاہا کرایہ ان سے وصول کرتا تھا، عام ریٹ سے دوگنے، بلکہ چار گُنا زیادہ بھی۔ اتنے سارے پیسے بٹورنے کے باوجود بھی ان کے آگے ہاتھ ہلا ہلا کر فارسی بولتا تھا۔

"حاجی صاحب۔ ہم کو بہت بُری عادت پڑ گئی ہے۔ تھوڑی سی پینے واسطے دیدو بس تھوڑا سا عطر۔" یارقندی یہ بات سُن آپس میں سرگوشیاں کرنے لگ جاتے اور اس سے سوال کرتے۔ "بتاؤ کتنا چاہیئے؟" کبیر گو ان کی ہر بات سمجھ لیتا تھا لیکن مکاری سے کام لے کر یوں بنتا تھا کہ جیسے کچھ نہ سمجھا ہو۔ ایسے میں ایک دم اپنی جیب سے چلم نکال کر ان کے آگے کر لیتا تھا اور چلم کے کس لے لے کر چرسیوں کا سا انداز اختیار کر لیتا تھا۔ یارقندی اس کا اشارہ پا کر مسکرا دیتے اور خوش ہو کر تولہ بھر چرس اس کے چلم میں بھر دیتے تھے۔ کبیر بھانڈوں کے سے انداز میں ان کو دعائیں دے دیتا۔

اب وہ زمانے ملنے والے نہ تھے۔ اُن دنوں کی یاد کبیر کے دل پر نقش تھی وہ آج چرس پیتا تھا لیکن کہاں اُن وقتوں کا نشہ۔ کہاں وہ یارقندی چرس اور کہاں یہ چلاسی تمباکو۔ یاد آتے ہی اُس کا من کھول اٹھنے لگتا۔ وہ بار بار اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر فکروں میں ڈوب جاتا تھا۔

یہ ان ہی وقتوں کی دین تھی کہ ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں ہونے کے باوجود اس قدر کٹا کٹا تھا۔ دیکھنے کو جوان سے بھی زیادہ طاقتور تھا۔ لوگ اس سے اکثر سوال کرتے تھے "کبیر تم نے اپنی جوانی میں ایسی کون سی بوٹی کھائی ہے جو آج بھی تمہاری نس نس سے جوانی پھوٹتی ہے؟"

البتہ قبائلی جنگ کے دوران اس کی زندگی میں بڑا طوفان برپا ہوا۔ اس کی تقدیر روٹھ گئی۔ ویسے حالات تو قبائلی حملے سے پہلے ہی بدلنے لگے تھے۔ ٹانگہ اسٹینڈ وجود میں آچکا تھا۔ سڑکوں پر اور بھی کئی ٹانگے دوڑنا شروع ہو گئے تھے۔ پھر بھی وہ خوش تھا اور کام میں مصروف۔

اس نے اپنے گاہکوں کو گویا رسی سے باندھ رکھا تھا۔ بغیر کوئی کرایہ بٹھائے وہ ان کو ٹانگے میں سوار کر دیتا تھا۔ اور منزل تک پہنچا کر من پسند کرایہ ان سے وصولنے لگتا تھا وہ لوگ

اس سے مانوس تھے۔ خوشی خوشی بڑی بڑی رقمیں اس کو دیتے تھے۔ وہ لوگ اس کی جان پہچان والے لوگ تھے یا ان کی اولادیں۔

باقی ٹانگے والے دن بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے سارا سارا دن سواری کے انتظار ہی میں گذار دیتے تھے۔ لیکن کبیر الگ سے اپنے مکمل کرتا رہتا تھا۔ اس نے ابھی تک اسٹینڈ والوں کی سرداری تسلیم بھی نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے ان کی پرواتھی۔ اس کے گاہک تھے جن پر اس کو ناز تھا۔

اس طرح کے حالات دیگر ٹانگے والوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔ لیکن وہ تو بس ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ جاتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے ذہنوں میں کبیر جیسے ظالم کے خلاف بغاوت کے کیڑے بھی کلبلانے لگ جاتے۔ اور کبھی وہ اس کے ساتھ یاری گانٹھنے کی سوچتے تاکہ وہ ان اصولوں کی پابندی پر آمادہ ہو جائے جو اسٹینڈ والوں نے اپنا کاروبار صحیح ڈھنگ سے چلانے کی خاطر وضع کر لیے تھے۔ وہ تو بس تدابیر ہی سوچتے رہ جاتے تھے لیکن اُس کا سامنا کرنے کی ان میں ہمت نہ تھی۔

آخر کار ایک شام جب کبیر بازار کا چکر لگا رہا تھا۔ ایک ٹانگے والے نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور باتوں ہی باتوں میں اسے اسٹینڈ کے اندر لے گیا۔ وہاں کئی اور ٹانگے والے بھی بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ کبیر کو دیکھتے ہی وہ خوش ہو کر کھڑے ہو گئے اور بہت ہی عزت کے ساتھ اُس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنالی۔

کبیر ٹانگے والے کو ان لوگوں کا رویہ دیکھتے ہی ان کی نیت پر شک ہونے لگا۔ وہ جان گیا کہ یہ لوگ اب کوئی چال چلنے والے ہیں۔ دوسری طرف ٹانگے والے خوش تھے۔ جیسے انہوں نے بڑی فتح حاصل کر لی تھی۔ وہ ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن انہوں نے اس کو پکڑ کر بٹھا دیا اور حقے کے بہانے باتوں میں لگا دیا۔ ایک ٹانگہ بان نے بزرگانہ انداز میں یوں بات شروع کی۔

"کبیر کاکا۔ ہم لوگ کئی دنوں سے سوچ رہے تھے کہ تمہارے ساتھ چند باتیں کریں۔ آج تم اچانک اس طرح آنکلے۔ کیوں نہ ہم دل کی بات کہہ دیں۔" بس اتنی سے بات ہے کبیر معاملے کی تہہ تک پہنچا تھا۔ چنانچہ وہ اکڑ کر بولا "بولو۔ میرے لیے کیا حکم ہے۔ لیکن ذرا جلدی۔ میرے پاس وقت نہیں۔"

”حکم نہیں کاکا۔ ہم تو صرف گذارش کرتے ہیں۔ تم تو پتا سمان ہو۔ لیکن اس کے باوجود جو تم کرر ہے ہو، وہ نہ تو برادری ہی کہلاتی ہے اور نہ ہی انسانیت۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم بھی ہم لوگوں میں گھل مل جاتے۔ اس بات کا ہم سبھی کو احساس ہے کہ تم اس علاقے میں ہمارے پیشے کے بانی ہو۔ اور اُستاد بھی۔ لیکن ہمارے ساتھ۔۔۔۔“ کبیر نے اُسے بات مکمل نہ کرنے دی۔ وہ بولا۔

”سنو بھائی۔ جو کوئی بھی تم ہو۔ میرے پاس یہ ساری فضول باتیں سُننے کا وقت نہیں۔ اور نہ ہی میں کسی کا پابند ہوں۔“ یہ سب کہتے ہوئے وہ حقارت سے ٹانگے والوں اور ان کے اسٹینڈ کو دیکھنے لگا۔ جیسے وہ بچے ہوں اور ان کے ٹانگے بچوں کے ٹوٹے ہوئے کھلونے۔ بات کا موضوع بدل کر انہیں وہ بزرگوں کے ہی انداز میں ڈانٹنے لگا۔ ”شاید راستہ بھول چکے ہو۔ ابھی تک تمہیں سیدھا راستہ کسی نے بتلایا نہیں۔ کیا تم مجھے دیوانہ سمجھتے ہو جو اپنے پچاس سالہ پرانے گاہک چھوڑ دوں۔“ واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اُس نے نسوار کی ڈبیا نکال لی۔ اور چٹکی بھر نسوار دانتوں پر ملتا ہوا اسٹینڈ سے باہر آ گیا۔ اتنی سی دیر میں اُس کا ٹانگہ سواریوں سے بھر گیا تھا۔ اونچی آواز میں گھوڑے کو پچکارتے ہوئے وہ ٹانگے میں بیٹھ گیا اور رعونت لے کر چل دیا۔ ٹانگے والے یتیموں کی طرح ایک دوسرے کی اُور دیکھتے رہ گئے۔ ان کا دل کبیر کے اہانت آمیز رویے کی بنا پر رو رہے تھے۔

قبائلی جنگ کیا ہوئی، گویا دنیا ہی بدل گئی۔ لمحہ بھر پہلے ہی وہ ایک فضا میں سانس لے رہے تھے کہ جس کو پُرانا اور بوسیدہ نظام کہا جاتا تھا اور لمحہ بھر بعد ہی ایک ایسے نظام میں آ گئے جواب تک سپنوں کا عالم لگ رہا تھا۔ سبھی کچھ اتنی سُرعت سے بدل گیا، انہیں لگا کہ جیسے ابھی ابھی بوئی گئی فصل تھوڑی دیر کی بارش کے لیے مرجھا سی گئی تھی۔ ہر شخص مصروف ہو گیا تھا۔ لوگوں میں امنگوں اور فرائض کا ایک جوش سا اُمڈ آنے لگا تھا۔ وہ ہوا کہ جس کے انتظار میں لوگ جانے وقتوں سے تھے، ایک ہی جھونکے میں آ گئی تھی اور شہر و دیہات میں پھیل گئی تھی۔ بغیر دیکھے اور بغیر سوچے سبھی نے نئی روش کو قبول بھی کر لیا تھا۔ نہ فائدہ دیکھا تھا اور نہ ہی نقصان کا سوچا تھا، بس جو بھی نئی چیز ان کو ہاتھ لگی، اس کے لئے آمنا و صدقنا کرتے رہے۔ اور اگر کسی نے نئی ہوا کو دیکھ کر اپنا منہ پھیرنا چاہا، اس کے ساتھ حسبِ مراتب مناسب سلوک بھی روا رکھا گیا۔ جواب تک پیدل جا رہا تھا۔ عدیم الفرصتی کے بہانے چند قدم جانے کے لیے بھی ٹانگے میں بیٹھنے

کو ترجیح دیتا رہا۔ اور دو چار آنے خرچ کرنے میں کسی بھی قسم کی قباحت محسوس نہ کی گئی۔ کام اس قدر بڑھ گیا کہ کسی کبیر کی فکر نہ رہی۔ ٹانگوں کی تعداد بڑھتی گئی، نئے نئے گھوڑے آگئے۔ اسٹینڈ کی بنیادیں مضبوط ہوتی گئیں اور ہر کام منصوبہ بند طریقے پر انجام پذیر ہوتا رہا۔ مختلف روٹوں کے لئے الگ الگ ریٹ مقرر ہوئے اور اسٹینڈ کے اندر باضابطہ ریٹ لسٹ آویزاں کیا گیا۔

نئے نظام کو دیکھ کر کبیر منہ بناتا رہا۔ اس پر پھبتی کسنے لگا۔ اسے اس نظام سے اس قدر نفرت تھی کہ تھو تھو کرتا ہوا اسٹینڈ کے آگے سے گذرنا اُس کا معمول بن گیا۔ اور مقابلے کے شوق میں علی الصباح گھر سے ٹانگہ لے کر نکلتا اور گاہکوں کی تاک میں رہتا تھا کہ کوئی بھی سواری اسٹینڈ کی اُور جانے نہ پائے کسی ٹانگے میں بیٹھنے نہ پائے۔ پھر بھی اسے یقین تھا کہ اس کے کئی ایک گاہک اسٹینڈ میں جا کر ٹانگوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کی آمدنی روز بروز کم ہوتی جارہی تھی۔ پھر بھی اس کی اکڑ برقرار تھی۔ وہ اسٹینڈ کے آگے سے گذرتے وقت اپنی مونچھ اوپر کرتا تھا۔ اور اس بات کا اظہار کسی پر نہ ہونے دیتا تھا کہ مالی اعتبار سے پریشان ہے۔ اس کا ٹانگہ خستہ حالت میں تھا۔ گھوڑے کی خوراک سے زیادہ ٹانگے کی مرمت ضروری تھی۔ اس ساری عمر کی محنت کا پھل بس ایک گھوڑا رہ گیا تھا جو بوڑھا ہو چکا تھا۔ اور بڑھاپے کی بنا پر اس قدر کمزور تھا بھیگی بلی بن کر رہ گیا تھا۔ لاغری نے اس کو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کے رکھ دیا تھا اور اس کی شکل دیکھ کر سبھی کی ہنسی چھوٹ جایا کرتی تھی۔ کمزوری نے اس کو اڑیل بنا دیا تھا۔ پچیس سال کا تجربہ آزمانے کے بعد بھی کبیر اس کا اڑیل پن دور کرنے میں ناکام رہتا تھا۔ وہ اس سے یارانہ گانٹھتا، اس کی گردن پر ہاتھ پھیر کر اس کو شاباشی دیتا اور کان میں بہت کچھ کہتا لیکن کبھی کبھی گھوڑا اس قدر ڈھیٹ بنتا کہ کبیر کی کسی بھی حرکت کا اس پر اثر ہی نہ ہو پاتا۔ بس ٹانگے کے بندھنوں سے آزاد ہونے کے لیے مچلتا رہتا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر لگتا تھا کہ ساری عمر سڑکوں پر دوڑ کر اب تنگ آگیا ہے اور آسمانوں میں جانے کے لیے پر تول رہا ہے۔ چنانچہ لاکھ پچکارنے پر بھی جب گھوڑے کی حالت نہ بدلتی تو کبیر اس پر چابک آزماتا تھا۔ چابک آزماتے وقت لوگ کبیر کے ڈھیٹ پن اور گھوڑے کے اڑیل پن کی داد دیئے بغیر نہ رہتے۔ گھوڑا اتنی مار کھانے کے باوجود بس ایک جگہ تھم جاتا تھا اور آگے یا پیچھے ہونے کا نام نہ لیتا تھا اور سواریاں چپ چاپ ٹانگے سے اُتر جاتیں نظر بچا کر کسی دوسرے ٹانگے میں بیٹھتیں یا پیدل چل دیتیں کیونکہ مروت کے ماروں میں اس قدر ہمت نہ تھی کہ اس کے دیکھتے کوئی اور سواری دیکھتیں۔ انہیں ڈر تھا کہ کبیر انہیں

زبردستی واپس اپنے ٹانگے میں بٹھالے گا اور پھر راستہ بھر انہیں ٹانگیں کو دھکا مارنے پر مجبور بھی کرے گا۔

چنانچہ اپنا خستہ حال ٹانگہ اسٹینڈ کے باہر یونہی سڑکوں پر دوڑانا اس کا مقدر ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار اُسے بھاری بوجھ اٹھائے کوئی سواری مل ہی جاتی تھی۔ ان حالات میں وہ دن رات اسٹینڈ والوں کو بد دعائیں دیتا اور اس امید میں کہ اڈے کی زمین ایک نہ ایک دن دھنس جائے گی، وہ اچھے دنوں کے انتظار میں اپنے دن کاٹ رہا تھا۔ اب یہ وقت بھی آپڑا کہ چائے والے کے چند روپے پچھلے پندرہ دنوں سے بھی واپس نہ کر سکا تھا۔ اس بات کا اُسے خوب احساس تھا کہ اس کے گھوڑے کو اگر اچھی طرح خوراک مل جائے تو پشاوری اور امرتسری چھوڑ دنیا کا ایک بھی گھوڑا اس کے مقابلے کی دوڑ نہ جیت پائے گا۔ لیکن گھوڑے کے ضروریات پورے کرنے کے وسائل اس کے پاس نہ تھے۔

آج بھی وہ سواری کی تلاش میں سرگرداں سڑکوں پر جارہا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی ضرور ہو گا جو ٹانگے کی تلاش میں ہو گا۔ لیکن بہت بھٹکنے پر بھی اس کا ٹانگہ کسی نے نہ روکا۔ اداس ہو کر وہ کبھی اڈے اور کبھی چائے خانے کو دیکھتا رہتا تھا۔ جانتا تھا کہ یہی وقت ہے جب اڈے میں ریل پیل ہوتی ہے اور ٹانگہ بان اپنے حال میں مست گرم گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہیں۔ لیکن خود اس کے لیے یہ دن بد بختی کی علامت بن گئے ہیں۔ چنانچہ ایک آہ بھر کر وہ ٹانگے میں بیٹھا۔ گھوڑا اس کا اشارہ پاتے ہی ایک طرف دوڑنے لگا۔ گھوڑے کا یہ انداز اُسے پسند آیا اُسے لگا کہ نہ صرف اس کی بلکہ گھوڑے کی ساری کمزوریاں اچانک دور ہو گئیں۔ وہ اسے پچکارنے لگا اور اطمینان کا سانس لے کر اپنا ٹانگہ اسٹینڈ کی جانب موڑ دیا۔ اسٹینڈ کے نزدیک ٹانگہ روک کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ اڈہ کسی کی بھی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ سبھی ٹانگے والوں کی مشترکہ میراث ہے۔ گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑ کر وہ اڈے کی جانب چل دیا۔

بوڑھا اور تجربہ کار گھوڑا اپنے مالک کا منشا جان گیا تھا۔ اور کبیر سوچ رہا تھا کہ جانور کی ہر حس بیدار ہوتی ہے۔ اڈے میں داخل ہو کر اب واپس جانا عقلمندی نہیں۔ خدا ہی جانے اُس کی مرضی کیا ہے۔ چنانچہ سب اُسی پر چھوڑ کر ٹانگہ پہلے نمبر پر لگا دیا اور خود سکندر کے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہاں اب بھی اُسے ایک کپ چائے ادھار مل سکتی ہے۔

فاروق مسعودی

کوہ قاف کی پری، جن اور ہیرو

ایک زمانہ تھا کہ کوہ قاف کی پری تھی اور ہیرو کا اس کے ساتھ عشق ہو گیا تھا۔ پری بہت خوبصورت تھی۔ کالے شہمار سے زُلف، ماہتاب جیسی پیشانی، آفتابی چہرہ، ابرو کمان، گلاب جیسی آنکھیں، ہنس کی سی لمبی گردن، اور چھاتیاں۔ انار دو پستان۔ اُس کی ناف کے نیچے دو عدد طلائی مُنارے بھی تھے کہ جن کے عقب میں لالہ ہائے گُل میں ایک عدد گوہر یک دانہ چھپا تھا۔ لالہ ہائے گُل کسی بھی علی بابا کے سم سم سے کھُلتے نہ تھے اور چابی اُس کی ایک جن نے کوہ قاف کے اندر کسی مٹکے میں چھپا کر رکھ دی تھی۔

پری اور ہیرو کے عشق کا انجام کچھ اس طرح کا ہوا تھا کہ جس طرح کا انجام ملک اور نوش لب، ہی مال اور ناگرائے، یوسف زلیخا اور لیلی مجنوں کے قصوں میں بیان کیا جاتا ہے۔

میں کوئی طلسم ہوش رُبا بیان کرنے میں ماہر نہیں۔ پھر بھی یہ داستانِ عشق آپ کو اپنے ہی الفاظ میں سُنانے کی جسارت کر رہا ہوں۔ بھلا کیوں کر؟ ہاں یوں۔ مثلاً کچھ ایسے۔۔۔



تار دیو اسٹوڈیو میں ڑھڈرس فلمز کے ایر کنڈیشن دفتر کے اندر پروڈیوسر نے 555 سگریٹ کا دھواں میرے منہ پر پھینکا اور بولا۔

"۔۔۔۔۔اور آگے؟"

اُچٹتی سی نظر میں نے پروڈیوسر پر ڈال دی اور دیکھا کہ اُس کے منہ سے رال گر رہی ہے۔ وہ جیسے کرسی میں لٹک گیا تھا۔ میں اسکرین پلے کا دوسرا سین سنانے لگا۔

"ہمارا ہیرو پھانسی کے تختے پر کھڑا ہے۔ عدالتی حکم کے مطابق اُسے دن ڈھلنے سے پہلے ہی عام لوگوں کے سامنے دی جائے گی۔ لوگوں کا اژدہام ہے اور پھانسی دئے جانے میں بس چند منٹوں کی دیر ہے۔ جمِ غفیر میں ایک لڑکی ہے کہ جس کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور چہرہ جس کا

زرد ہے۔زعفرانی رنگ کا۔وہ لوگوں کی اس دھکم پیل میں آہستہ آہستہ پیچھے جا رہا ہے اور اُلٹے پاؤ ں بھاگ جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اُس میں خوفناک منظر دیکھنے کی تاب نہیں۔ اُس کا دل بیٹھا جا رہا ہے اور ٹانگیں لرز رہی ہیں۔

سورج ڈوب رہا ہے اور پھانسی دیے جانے میں بس دو منٹ باقی ہیں۔جج صاحب ہیرو سے پوچھ رہے ہیں۔

"تمہاری کوئی آخری خواہش تو ہوگی، جسے ہم پورا کر سکیں۔ مثلاً سگریٹ کا ایک کش وغیرہ۔" ہیرو جواب دیتا ہے کہ "ہاں"

"کیا؟" جج سوال کرتا ہے

"میں اس ہجوم سے دو ایک باتیں کرنا چاہوں گا اور ایک لڑکی کو بلوانا چاہتا ہوں۔"

جج صاحب دیگر افسران کے ساتھ کچھ دیر تک صلاح و مشورہ کرتے ہیں۔یوں ہیرو کو اپنی خواہش پوری کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ لیکن شرط رکھی جاتی ہے کہ بات اور بُلاوا، دونوں کا انداز مُہذبانہ ہونا چاہیئے۔ ہیرو یہ شرط بھی مان لیتا ہے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

"حضرات اب میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ میں بے قصور ہوں۔بے گُناہ ہوں۔ مجھے شکار بنایا گیا ہے کاغذ کے پُرزوں کا، نب اور فاونٹین پین کا، عدالتی قوانین کی سازش کا شکار ہو گیا ہوں میں۔ میرے پاس اپنی بے گُناہی کا صرف ایک ثبوت ہے اور وہ ہے وقت۔ آنے والا وقت میری بے گناہی ثابت کرے گا۔الوادع میرے بھائیوں۔۔۔"

ہجوم پر خاموشی چھا جاتی ہے۔لوگ ایک دوسرے سے آنکھ ملانے سے بھی ڈرنے لگتے ہیں۔اور اسی دل ہلا دینے والی خاموشی میں وہ لڑکی واپس جاتی۔ ہیرو اُسے پکارتا ہے

"شکتی!!"

لڑکی سہم کر رُک جاتی ہے۔اس کی ہچکی بند ہو جاتی ہے۔

"شکتی ۔۔ تم اگر اس ہجوم میں کھڑی ہو اور مجھے سچے دل سے چاہتی ہو۔سارے بندھن توڑ کر میرے نزدیک آجاؤ۔ اور اگر تم مجھے نہیں چاہتی۔جب بھی کوئی غم نہیں۔۔۔ کاش کہ تم آہی جاتی۔۔۔"

ہیرو کا گلا بیٹھ جاتا ہے۔وہ کچھ بول نہیں پا رہا۔لڑکی دوڑ کر ہیرو کے پاس آجاتی ہے۔

لوگ حیران ہیں۔ ہیرو اس کو دیکھتا ہے اور چلا کر پکار اُٹھتا ہے "شکتی۔۔۔" جج اعلان کرتا ہے کہ اب پھانسی دئے جانے میں صرف ایک منٹ کی دیر ہے۔

کیا ہی طوفانِ بد تمیزی تھا۔ لوگوں میں تذبذب تھا اور ان کی عقل پر گرد وغُبار چھایا ہوا تھا۔ کچھ خبر نہ تھی کہ کون کیا ہے۔ کون لٹیرا ہے اور جنگی۔ کون فاتح ہے اور کون آزادی کا پیامبر۔ تذبذب تھا اور لوٹ مار تھی۔ ہر طرف آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اور یہی سب کچھ جیسے کندن ہو کے رہ گیا تھا۔

۔۔۔۔ اور قبائلی آگے بڑھتے رہے۔ وہ عورتوں کے کانوں سے اُن کی بالیاں اور سر سے ڈیجہ ہور بھی چھین کر لے گئے تھے۔



اُس نے پردہ کھول دیا ہر چیز سُرخ ہو گئی تھی۔

کھڑکی کے باہر دور پہاڑوں کے عقب میں سورج ڈوب رہا تھا۔ اُسے یہ اچھا لگا۔ چنانچہ اُس کا اپنا رنگ بھی لال پڑ گیا۔ یوں جیسے ایک فلرٹ شاٹ تھا، جس میں ہر چیز پر لالی چھا جاتی ہے۔ اور لال تھا اُس کا اپنا رنگ۔ لال تھا سورج کا رنگ۔ اور لال رنگ تھا پانی کا جس میں لال لال شکارے تیر رہے تھے۔ پھول سُرخ تھے اور سُرخ اس کمرے کا قالین بھی تھا۔ لال رنگ زندگی کا تھا اور لالی سب کے خون میں بھی چھائی ہوئی تھی۔

(اور لال رنگ تھا پری کے گوہر یک دانہ کا)

چنانچہ وسکی کا ایک اور پیگ لے کر وہ ویٹر کو پکارنے لگا۔ ایمبیسی ہوٹل کا ویٹر دوڑا ہوا آیا اور لال ٹوپی سر پر رکھے کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اُس نے اپنی جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال لیا اور ویٹر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ویٹر یہ نوٹ لینے سے انکار کرنا چاہ رہا تھا لیکن Tip کے نام پر یہ رکھنا ہی پڑا۔

اس کے بعد وہی گھِسا پِٹا سا سوال۔ "یہاں لڑکی مل سکتی ہے؟"

اور ویٹر جیسے اس سوال کے لیے پہلے ہی سے کھڑا تھا۔ جب سے وہ پیدا ہوا تھا، ہر سیاح روزانہ یہی سوال پوچھا کرتا تھا۔ "لڑکی ملے گی یہاں؟"

اور ویٹر نے جواب میں "ہاں" کہہ دی۔ اور اس کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، اُس نے بٹوہ کھول کر دیکھا۔ ایک ہزار کے قریب رقم اُس کے اندر ابھی تک موجود تھی۔



میں نے شکتی کا کلوز آپ لیا اور سگریٹ سلگانے لگا۔ 555 کے سگریٹ کا دھواں پروڈیوسر نے مری طرف اُچھالا تھا، اب میں نے واپس اس کے منہ پر پھینک دیا۔ اور گھور کر اُس کو دیکھنے لگا۔ وہ کرسی کے اندر دھنس گیا تھا۔ اس کے منہ سے اتنی زیادہ رال گر کر بہہ چکی تھی کہ میرے جوتوں تک آ گئی تھی۔ میں اپنا سارا جمع خرچ مجتمع کر کے ہیرو پر آزمار ہا تھا۔

ہیرو شکتی کو پکار رہا ہے۔۔۔ "شکتی"

شکتی دوڑ کر آتی ہے اور ہیرو کے گلے لگ جاتی ہے۔ رو رو کر دونوں کا گلا رُندھ جاتا ہے۔ اور جج اعلان کرتا ہے کہ بھانسی دیئے جانے میں اب بھی ایک منٹ باقی ہے۔ ہیرو رو رو کر شکتی کے کان میں کہتا ہے۔

"شکتی! مجھ سے شادی کرو گی۔ ابھی اور اسی وقت۔"

"ہاں۔ ہاں ہاں۔" شکتی زور سے چلاتی ہے اور ہیرو اس کی ننگی چھاتیوں میں اپنے ہونٹ پیوست کر دیتا ہے۔ اور دانت گاڑ دیتا ہے۔

کرسی کے اندر جما ہوا پروڈیوسر اپنی رال پونچھتا ہے۔ اس پر اُچٹتی سی نگاہ ڈالتا ہوا میں آگے بولنے لگتا ہوں۔

"شکتی کی چھاتیوں کے دو اُبھاروں کے بیچ سے قطرہ قطرہ خون رسنے لگتا ہے۔ ہیرو اسی خون میں اپنا انگوٹھا ڈبوتا ہے اور اسی خون سے شکتی کے ماتھے پر ٹیکہ لگا کے اُس کی مانگ میں سُہاگ بھرنے لگتا ہے۔"

قبائلی ورمُل واپس آ گئے ہیں۔ انہوں نے شیروانی کو بے بس کر کے درخت سے باندھ رکھا ہے۔ کیونکہ شیروانی نے دھوکے سے انہیں غلط راستے پر لگا دیا تھا اور اس جُرم کی پاداش میں انہوں نے شیروانی کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیا ہے۔

"شیروانی اپنی جان اپنی ماں پر نثار کر چکا ہے۔" لوگ اسی مخمصے میں گرفتار تھے۔ کچھ خبر نہ تھی کہ کون کیا ہے۔ کون لیٹرا ہے اور کون لڑاکو۔ کون فاتح ہے اور کون آزادی کا متوالا۔ کون شہید ہے۔

ہر طرف قتل و غارت تھا اور لوٹ مار تھی۔ اور یہی کچھ کُندن بن کے رہ گیا تھا۔



سورج کب کا ڈوب چکا تھا۔ شکارے بیٹھے بیٹھے ہی اُس نے ویٹر سے دریافت کرنا چاہا کہ ابھی کتنی دور تک جانا ہے۔ اُسے اندھیروں سے نفرت تھی۔ اور اسی لئے بے چین تھا۔

ویٹر بولا۔ "بس اب تو آ ہی گئے ہیں" اُس نے اپنا شکارا گاف گراونڈ کے نزدیک کنارے لگا دیا۔ اور ویٹر کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اب وہ بنڈ پر آ گئے تھے۔ جہاں اندھیرا بہت گہرا تھا۔ آگے پیچھے کچھ بھی نہ دکھائی دے رہا تھا۔

"کہاں رہ گئی ہے وہ۔۔۔؟" گہرے اندھیرے میں اُس کی آواز گونجی۔ ویٹر جب بھی چپ رہا۔

پھر اُس کے بعد۔ ویٹر نے اُس کا سر کاٹ دیا۔ اگلی صبح راہ چلتے لوگوں نے ایک سر کٹی لاش پائی۔ سارے شہر پر خوف چھا گیا۔

"سری نگر میں قتل کی واردات۔"



میرا سگریٹ بُجھ گیا تھا۔ پروڈیوسر نے ایک سگریٹ میری طرف اچھال دیا اور دوسرا اپنے ڈسٹی بیوٹر کو دیا۔ تیسرا سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دباتے ہوئے بولا۔

"پھر۔۔۔ اس کے بعد؟"

میں اپنا سگریٹ سلگانے کے لیے لائیٹر تلاش کرنے لگ گیا۔ پروڈیوسر نے سگریٹ سلگانے کے بعد اپنا لائیٹر میری اُور کر دیا اور میرے بعد ڈسٹی بیوٹر کی طرف بڑھانے لگا کہ اُس نے لائیٹر کے اس شعلے سے اپنا سگریٹ سلگانے سے انکار کر دیا۔ وہ بولا۔

"ایک ہی شعلے میں سے تین سگریٹ سلگانے کا رواج نہیں۔ یہ بدشگونی کہلاتی ہے اور ایسا کرنے سے ایک دوسرے کے خلاف بدگمانی کا خطرہ رہتا ہے۔" چنانچہ اُس نے ماچس کی تیلی سے اپنا سگریٹ سُلگا لیا۔

"تم یہ بولے ہی نہیں کہ آگے کیا ہونا ہے" ڈسٹری بیوٹر رال پونچھتا ہوا مجھ سے پہلے ہی بول پڑا۔

"ایک دُکھی گیت۔۔۔ رونا دھونا۔۔۔ بین۔۔" وہ میری طرف نظریں اٹھا کر بولا "کیوں ٹھیک ہے نا؟"

میں نے سر ہلا کر حامی بھر لی اور کہا۔

"اور بین کے ختم ہوتے ہی ہمارا ہیرو پھر سے زندہ ہو جائے گا، اس پر اب پروڈیوسر کے چہرے پر رونق آ گئی۔ وہ بولا۔

"شاباش۔ ہم، ہیرو کو نہیں مار سکتے۔ ورنہ فلم فلاپ جائے گی۔ ہیرو کو تو ہر حال میں زندہ رہنا ہے۔

اور یوں میں نے ژھڈرس فلمز کے ایر کنڈیشن دفتر میں معاہدے پر دستخط کر دیے۔ اور خوش ہو کر ہمارے ڈسٹی بیوٹر نے ہیرو کی ماں کے نام گالی دی۔

☆☆

کوہ قاف پر ٹھیکری کے کھیل کھیلتے ہوئے ہیرو جن کی طرف پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور زور سے چلاتا ہے۔

"ایم گول۔۔۔۔"

جن دیکھتا ہے کہ ہیرو کا ایک پاؤں اب بھی لکیر پر پڑا ہوا ہے۔ وہ نہ دوزخ میں کھڑا ہے اور نہ ہی جنت میں۔۔۔ وہ ہیرو کے چوتڑ پر لات مارتا ہے اور چلاتا ہے۔

"مر گئے ہو تم۔۔۔"

پھر یوں ہوا کہ نہ ہیرو تھا اور نہ یہ کہانی۔ اگر کچھ تھا تو صرف پری تھی جس کی کوکھ سے دیوازاد نے جنم لیا تھا۔ اور جن، دور کہیں کوہ قاف کے غار میں پڑا سلاجیت کھا رہا تھا۔

محمد زمان آزردہ

راز

سُلہ جو آج بھی دیر گئے گھر لوٹا تھا۔ اُس کی بیوی جانو اس سے بولی "آج بھی دیر سے لوٹے ہو۔ حالانکہ جلدی آنے کے لیے تم سے کہا بھی تھا؟"

سُلہ جو۔۔۔ گھر سے نکلنا اپنے بس میں ہو تو ہو، لیکن لوٹنا اپنے بس میں نہیں۔

جانو۔۔۔ بھلا اتنی دیر کہاں رہے۔ دیکھو تو سہی گُل کی کیا حالت ہے۔

سُلہ جو۔۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اللہ اُسے ٹھیک کر دے گا۔ کہاں ہے وہ؟

جانو۔۔۔ اندر پڑا ہے۔

سُلہ جو اٹھا اور اندر چلا گیا۔ وہاں جاکر دیکھا کہ گُل کا بدن بُخار سے تپ رہا ہے۔ سُلہ جو نے اپنے بارہ سالہ بیٹے کے منہ پر ہاتھ پھیرا اور اسے تھوڑا سا پانی پلا دیا۔ اور جانو سے بولا۔ "تم اس کو تھوڑا تھوڑا پانی پلاتی رہنا۔ میرے کھانے کے برتن میں گوشت رکھا ہوا ہے۔ اس کا شوربہ تیار کرنا۔ شام کو اسے شوربہ پلانا ہے۔ انشاءاللہ کل صبح تک بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

جانو نے گوشت اُبلنے کے لیے رکھ دیا، جب تک کہ سُلہ جو نے نماز پڑھی۔ بیوی نے اتنی دیر میں اس کے آگے چائے بھی رکھ دی تھی۔ سُلہ جو چائے پینے لگا۔ سُلہ جو چائے پی رہا تھا کہ جانو دوبارہ بول پڑی۔

جانو۔۔۔ تم جو دیر گئے نہ آتے تو گل کو ڈاکٹر کے یہاں لے گئے ہوتے۔

سُلہ جو۔۔۔ گھر میں جلدی ہی لوٹ آیا تھا۔ لیکن یہ رحیم جو والے شوگلہ پنڈت کے گھر والوں سے لڑ رہے تھے۔ مجبوراً وہاں رکنا پڑا۔ میں نے دونوں کو ڈانٹ پلا دی۔ تب کہیں جا کے وہ لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے۔

جانو۔۔۔ ان کا تو اور کوئی کام ہے نہیں۔ بس ہر وقت لڑتے رہتے ہیں۔ آخر معاملہ کیا تھا؟

سُلہ جو۔۔۔ بات تو کچھ نہ تھی۔ بس شیطان غالب ہو گیا تھا۔ تم اللہ کا شکر کرو کہ

تمہارے یہاں اڑوس پڑوس میں کوئی رشتہ دار نہیں۔ تم بھی یقیناً ان سے لڑتی ہی رہتی۔

جانو۔۔۔ بھلا میں کیوں لڑتی؟؟ میں اُس دن بھی کچھ نہیں بولی تھی جس دن تم نے اپنی ساری جائیداد اپنے چھوٹے بھائیوں کو بخش دی تھی، اور ہم یہاں اس جھونپڑی میں رہنے کے لیے آگئے تھے۔ یہاں آکر میں نے فاقے بھی کئے لیکن حرفِ شکایت زبان تک نہ لائی۔

سُلہ جو۔۔۔ اصل میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ فقیر کی بیوی فقیرنی اور امیر کی بیوی امیرن۔ بھلا اللہ نے تمہیں کس چیز سے محروم رکھا ہے۔

جانو۔۔۔ یہ سچ ہے تھوڑی بہت تکلیف تو اُٹھانا پڑتی ہے۔ لیکن۔۔۔۔

سُلہ جُو۔۔ لیکن کیا؟

جانو۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔ میں ذرا سالن دیکھتی ہوں۔ چولھے پر رکھا ہے۔

جانو ہانڈی میں رکھے سالن کو ہلاتی ہے اور سوچتی ہے کہ میرے خاوند میں دیکھنے کو تو کوئی عیب نہیں۔ لیکن ان کی عادت ہے کہ دوسروں کے پھٹے میں بے مطلب ٹانگ اڑاتے ہیں۔ اپنے آپ کو یوں پھنسا لیتے ہیں کہ گھر کی یاد نہیں رہتی۔ کوئی حاجت مند مل جائے تو اپنا سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ جو کچھ میں بھی اپنے پاس ہوگا، اُٹھا کر اُسی کو دے دیں گے۔ خود کا کھانا بھی پیٹ بھر نہیں کھاتے۔ چاہیں تو گھنٹوں نماز میں مشغول رہیں گے۔ صبح اور شام محلے والوں کے درمیان گذارتے ہیں۔ کہیں کسی رشتہ دار کے بیمار ہونے کی بھنک پڑ جائے یا کسی دوست کے تکلیف میں ہونے کا پتہ چل جائے تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ وہیں دوڑ پڑیں گے۔ حیرت تو مجھے اس بات پر ہے کہ یہ لوگوں کی دشمنی بھی بھول جاتے ہیں۔

وہ ان ہی سوچوں میں محو تھی کہ گُل کی آواز آئی۔ ''اماں۔ مجھے پانی چاہیئے۔''

جانو نے بیٹے کو پانی پلا دیا۔ وہ بولا کہ بھوک بھی لگی ہے۔ چنانچہ جانو نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور پتہ چلا کہ بُخار اُتر رہا ہے۔ اس پر جانو کے چہرے پر رونق آگئی اور سُلہ جُو کے پاس خبر لے گئی۔

جانو۔۔۔ تم نے دیکھا؟ گُل کا بُخار اتر بھی گیا ہے!!

سُلہ جُو۔۔ ہنس کر۔ تم اسے پیالی بھر شوربہ پلا دو۔ کل تک اللہ بالکل ٹھیک کردے گا۔



اگلی صبح سلہ جو کام کے لیے چل پڑا کہ راہ میں اُسے ایک بہت ہی پرانا دوست خضر محمد

مل گیا۔ سُلہ جو نے اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور بغل گیر ہو کر خیریت پوچھی۔ لیکن خفر محمد کے انداز سے پتہ چلا کہ بات کرتے وقت اس کی آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔ یہ جان کر سُلہ جو کو دُکھ ہوا وہ تکلیف میں ہے۔ وہ بولا۔

سُلہ جُو۔۔۔ ارے خفر محمد! یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے۔ تُم ٹھیک تو ہو نا؟

خفر محمد۔۔۔ سُلہ صاحب! اب کہاں کی داستان سیف الملوک لے بیٹھوں۔ اس کے سُنانے کے لیے وقت چاہیے۔

سُلہ جُو۔۔ (خود کلامی میں) اس بے چارے کی صرف لڑکیاں تھیں۔ ضرور گھر میں روپے پیسے کی تنگی ہو گی، جبھی اس قدر پریشان ہے۔ غریب ہونا بھی ایک مصیبت ہے۔ خیر کل مجھے خرچہ مل ہی جائے گا۔ اچھا ہے اس کی مدد کی جائے۔

خفر محمد۔۔۔ سُلہ صاحب۔ کن خیالوں میں کھوئے ہو؟ سُلہ جو خفر محمد کی بات سُن کر جیسے گہری نیند سے جاگ اُٹھا اور فوراً بول پڑا۔

سُلہ جُو۔ بھئی خفر محمد۔ میں کل شام کو تمہارے گھر آؤں گا۔ تم حوصلہ رکھو۔ اچھا۔

خفر محمد۔۔۔ اب وہاں تمہیں راستہ کہاں ملے گا۔ میرے پڑوس میں بڑی بڑی کوٹھیاں تعمیر ہوئی ہیں البتہ میری جھونپڑی ابھی تک اُسی جگہ کھڑی ہے، جہاں ہم اور تم اکٹھے رہا کرتے تھے۔

سلہ جُو۔۔ کیا باتیں کرتے ہو خفر محمد۔ بھلا وہ بھی کوئی آدمی ہو گا جو اپنا ماضی بھول جائے۔ بھئی آج میری آنکھوں میں تمہاری والدہ رچی بسی ہے۔ یاد ہے کس دُلار کے ساتھ ہم دونوں کو کھلاتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ تمہاری ہی طرح ہم سبھی نے یعنی حسہ لالہ، سُلہ کا چرواور شمبوناتھ نے بھی اُسی کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ بہر حال میں کل ضرور آؤں گا۔

سُلہ جُو کارخانے کو چل دیا اور خفر محمد اپنے گھر۔ راستے بھر سُلہ جُو سوچتا رہا۔ "یہ بھی اچھا ہوا کہ گُل ٹھیک ہو رہا ہے۔ کل تک وہ بالکل ٹھیک ہو گا۔ جانو زیادہ پریشان نہ رہے گی۔ البتہ اُس کی عادت ہے کہ گُل کے ہوتے وہ گھر میں ٹھیک ہی رہے گی۔ تاہم میں رات ہی کو گھر لوٹنے کی کوشش کروں گا۔



۔۔۔سُلہ جُو نے آج صبح کو ہی جانو سے کہہ دیا تھا کہ شام کو میں اُمبر ہیر جارہا

ہوں۔ ممکن ہے وہاں مجھے دیر لگ جائے۔ اور اگر مجھے زیادہ دیر ہو گئی تو تم فکر نہ کرنا۔ میں رات کو وہیں رکوں گا اور اگلی صبح لوٹ آؤں گا۔ اور دن بھر اسی مخمصے میں رہا کہ خرچہ لے کر جلد ہی چلا جاؤں گا۔ چنانچہ کاریگر اپنا اپنا خرچہ لے کر جانے لگے۔ یہ ان کا معمول تھا کہ تنخواہ ملتے ہی وہ آدھ دن کی چھٹی کرتے تھے۔ سُلہ جو بھی جانے کے لیے تیار تھا اور علی بٹ کو آواز دی۔۔۔

علی بٹ اس کا ہم عمر تھا۔ دونوں اس کارخانے میں ساتھ ساتھ ملازم ہوئے تھے۔ اور ان کی آپس میں خوب بنتی تھی۔

علی بٹ۔۔۔ ہاں بولو سُلہ جُو، کیا کہنا چاہتے ہو؟

سُلہ جُو۔۔۔ آج اُمبر ہیر تک جا رہا ہوں۔ چونکہ تمہارا گھر بھی اسی طرف پڑتا ہے، کیوں نہ ہم اکٹھے چل دیں۔ (علی بٹ کچھ سوچنے لگا اور سُلہ جو بولا)۔

"تم اگر کہیں اور جا رہے ہو تو بتاؤ۔ میں اکیلا ہی نکل جاؤں گا۔"

لیکن علی بٹ فوراً بول پڑا

"علی بٹ۔۔۔ نہیں بھئی۔ گھر ہی جا رہا ہوں۔ البتہ راستے میں وچارناگ کے قریب دس پندرہ منٹ کے لیے رُکنا پڑے گا۔"

"سُلہ جُو۔۔۔ وہاں رُک کر کیا کرو گے؟۔"

علی بٹ۔۔ "وہاں ایک درویش آیا ہوا ہے۔ سوچا تھا اُس سے کہہ کر اپنے لئے خیر و برکت کی دُعا کر والوں۔"

سُلہ جو۔۔۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ چلو میں بھی اُس سے خضر محمد کے حق میں دُعا مانگنے کے لیے کہہ دوں گا۔"



دونوں وچارناگ آگئے وہاں ایک چشمے کے کنارے درویش کو بیٹھے دیکھا۔ درویش ہاتھ میں تسبیح لئے، آنکھیں بند کئے وظیفہ پڑھنے میں محو تھا۔ سُلہ جُو نے علی بٹ کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ عبادت میں مست ہے۔ ڈرتا ہوں مجھے دیر نہ ہو جائے۔ خضر محمد میرے انتظار میں ہو گا"۔ اس کے یہ کہتے ہی درویش نے آنکھیں کھول دیں۔ ان دونوں نے اُسے سلام کیا۔ سُلہ جُو اور علی بٹ دونوں نے اس سے دُعا کی خاطر استدعا کی۔

درویش بولا۔ "سردی بہت ہے اور میرا غُسل کرنے کا ارادہ ہے۔ تم لوگ جب تک

آگ تیار کرلو۔ یہ لکڑی رکھی ہے یہ ماچس ہے۔"

غسل خانہ ایک چشمے کے قریب تھا۔ درویش غسل خانے کے اندر داخل ہوا۔ اور علی بٹ لکڑی اکٹھی کرنے لگا۔ اُس نے سُلہ جُو سے کہا۔ "لکڑی گیلی ہے اس کے لئے مٹی کے تیل کی ضرورت ہوگی۔ ایک آہ بھر کر اُس نے تیلی جلا کر آگ سلگانا چاہی، لیکن اس سے کچھ بھی نہ ہوا۔ لکڑی گیلی تھی اور ایک ایک کر کے اس نے ساری تیلیاں جلا کر پوری ماچس ختم کر دی۔ اب صرف ایک تیلی بچی تھی اور لکڑی ابھی تک ویسی تھی۔ آگ نہ جلی۔ درویش غسل خانے سے باہر آیا اور بولا۔

"کیوں۔ آگ نہیں جلی کیا؟" علی بٹ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ ادھر سُلہ جُو خفر محمد کی بنا پر الگ سے فکر مند تھا کہ وہ اس کی راہ دیکھ رہا ہوگا۔ ان ہی خیالوں میں گُم، سُلہ جُو نے علی بٹ کے ہاتھوں سے ماچس لے لی اور بولا۔ "میرے خدا آج تک میری عزت بچائی ہے۔ آج بھی میری لاج رکھنا۔"

یہ کہتے ہی سُلہ جُو نے آخری دیا سلائی جلائی اور جلتی ہوئی تیلی لکڑی کو دکھادی۔ دیا سلائی کے قریب آتے ہی لکڑی نے آگ پکڑ لی۔

علی بٹ حیران نگاہوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی حیرانگی اپنی جگہ، لیکن درویش چونکہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، ایک دم سُلہ جُو کے پاؤں پکڑ کر چلانے لگا۔

"اے خدا کے سچے دوست۔ میری رہبری کر" سُلہ اچانک کھڑا ہو گیا۔ اور تیز تیز قدموں سے وہاں سے جانے کے لیے مُڑ گیا۔ وہ خود سے بڑبڑا رہا تھا۔

"خفر محمد میری راہ دیکھ رہا ہوگا۔ وہ میرے انتظار میں ہوگا، اب کیا منھ لے کر اُس کے پاس جاؤں۔" وہ اچانک دوڑنے لگا۔ درویش، علی بٹ دونوں اس کے پیچھے لپکے۔ درویش، علی بٹ سے مخاطب ہو کر بولا "اس شخص کے اندر ضرور کوئی راز ہے۔ ورنہ یہ گیلی لکڑی کہاں آگ پکڑ لیتی۔"

جانے کہاں سے سُلہ جو میں اتنی طاقت آگئی تھی۔ درویش اور علی بٹ اسے پکڑ نہ سکے۔ اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔۔۔ یہاں تک کہ وہ ان کی نظروں سے دور ہو گیا۔

نور محمد روشن

پو پھٹتے ہی

برسات کے آخری دن تھے۔ دھوپ اور چھاؤں آپس میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ابھی تیز دھوپ نکلی کہ درختوں کے پتے دھوپ کی تمازت سے مُرجھا کر ڈالیوں سے لٹک گئے۔ پرندے ہانپنے لگے اور ابھی بادل گھر آئے کہ زوروں کی بارش ہوئی اور سب کچھ جل تھل ہو گیا۔

بہر حال، یہاں کا معمول ہے۔ لیکن آج کے دن پچھلے پہر سے فضا میں اُمس چھائی ہوئی تھی۔ آسمان میں ہلکے بادل تھے۔ لگتا تھا کہ سورج آنکھوں پر پٹی باندھے اپنا منھ چھُپاتا پھر رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں نڈھال ہوئے جا رہے تھے۔ ایک بار بیٹھ جانے کے بعد دوبارہ اٹھ کھڑا ہونا محال ہو رہا تھا اور چلنا دوبھر۔

فتح کدل کا بازار جہاں روز گہما گہمی رہتی ہے، آج کے دن سُنسان لگ رہا تھا۔ کبھی کوئی تھکا ماندہ مسافر یا راہ گیر نظر آ ہی جاتا تھا، جسے سُستانے کی خاطر کسی سائے کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا ہو۔ پرندے مکانوں کے چھجے تلے اپنی آنکھیں موندے کسی کے انتظار میں بیٹھے تھے کہ جس سے یہ اپنی بولی بول سکیں، جسے دیکھ کر یہ اُڑ سکیں، چہچہا سکیں۔ دکان دار اپنی دکانوں میں بیٹھے جانے کن فکروں میں کھوئے تھے۔ ایک تو دن کا کرایہ، دوسرے داد اگیری کرنے والوں کے لیے تاوان کی رقم، اس پر گھر کی ضروریات، خریداروں کا فقدان۔

دور کہیں سے ٹھٹھیرے کی دکان پر تانبا کوٹے جانے کی آوازیں آ رہی تھیں، جس کی ٹھائیں ٹھائیں سے دماغ کے اندر پڑے سوچوں کی ریزہ کاری ہو رہی تھی۔ دوپہری کی گرمی میں سب لوگ بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ستہ ستار کے کارخانے کی اُور کینہ توز نظروں سے گھورتے بھی رہتے تھے۔ وہ ستہ ستار کا کارخانہ اسی بازار میں ایک مکان کی دوسری منزل پر تھا۔ وہاں سے سارا سارا دن ٹھک ٹھک کی آواز لگاتار آتی تھی۔ یہ آواز سبھی کے دلوں

پر چاروں پہر کچو کے لگاتی رہتی تھی۔ ان کو دوستہ ستار کے کارخانے سے نفرت تھی لیکن کچھ کرنے کی بجائے اکثر اوقات اپنے آپ کو یوں سمجھاتے تھے کہ "آخر پیٹ تو ہے۔"

البتہ دوستہ ستار ان ساری باتوں سے لاتعلق سر اور ٹانگیں جوڑے ہاتھوں میں شٹل اور تھاپی اٹھائے کام میں مگن رہا کرتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ "خیر سے میں کارخانہ دار ہوں۔ میرے کئی کارندے ہیں۔ کارخانہ داری ہے۔ میرے لئے ضروری ہے کہ اپنی ساکھ بنائے رکھوں۔"

یہی ایک احساس تھا جو اسے بیکار نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ آج بھی وہ بُری طرح کام میں جُٹا ہوا تھا۔ دائیں بائیں اس کے تمام اوزار بکھرے پڑے تھے۔ ان میں سے وہ ایک کے بعد دوسرا اُٹھاتا رہتا تھا اور ان ہی کی مدد سے اخروٹ کی میز پر نقش و نگار بناتا جا رہا تھا۔ ویسے تو اس نے میز پر جنگل کی طرح ڈالی ہوئی تھی جس کے حاشیے میں تھوڑی سی ریزہ کاری بھی ہوئی تھی۔ شہر میں اور بھی کاریگر تھے اخروٹ کی لکڑی پر کھدائی کا کام کرتے تھے۔ لیکن دوستہ ستار نے اس میز کا کام ہاتھ میں لیتے وقت اپنا سارا فن کام میں لگا دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کشمیر کے تمام جنگل اسی ایک میز میں سموئے گئے ہیں۔ نقوش ایسی خوبصورتی سے اُبھارے گئے تھے کہ ہر خاکے پر اصل کا گمان ہو رہا تھا۔ دیودار کے درخت اور جنگلی جانور، پہاڑ اور ہانگل، شیر اور چیتا۔ حالانکہ اس طرح کے نقوش لکڑی پر اُبھارنا اُس جیسے کاریگر کے لیے بڑی بات نہ تھی، وہ پچھلے پچیس برس سے یہ کام کر رہا تھا۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی اور وہ پسینے میں نہا گیا تھا۔

جب کہ اُس نے نسواری رنگ کا اونی پھیرن پہن رکھا تھا۔ گرمی ہو یا سردی، بہار ہو یا خزاں اس کے لباس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوتی۔ لیکن کبھی کبھار سر سے پگڑی اُتار کر ماتھے پر ہاتھ پھیرنے لگتا ہے اور نہ جانے کن فکروں میں کھو جاتا ہے۔ سوچتا رہتا ہے کہ پتھر سے بھی زیادہ سخت اخروٹ کی لکڑی کو اپنے ناخنوں سے کھُرچ کر بھی اُسے کوئی بڑا فائدہ نہ ملا۔ البتہ اپنے ہی ہاتھوں کی فن کاری دیکھ کر خود بھی حیران رہ جاتا ہے۔ خوبصورت مناظر جن میں ایک شکاری ہاتھوں میں بندوق تھامے بھاگتے ہوئے ہرن پر نشانہ باندھے دکھایا گیا ہے اور بے چاری ہرنی خوف کی ماری محض جان کی خاطر بھاگتی پھرتی ہے۔ ہرنی کی حالت دیکھ کر بذات، خود فن کار بھی تھرّا اُٹھتا ہے، اس کے ہاتھ رُک جاتے ہیں، ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں اور دہشت کا مارا وہ ایک بار چلا اٹھتا ہے۔

"ہائے مار دیا۔ بے چاری۔"

اُس کے شاگرد اُس کی خود کلامی دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں اور خوف سے اپنے اُستاد کو

دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ وہ اس سے سوال کرتے ہیں لیکن اس سے جواب نہیں بن پاتا۔ شرمندگی سے اُس کے ماتھے پر پسینے نمودار ہونے لگتے ہیں۔ منظر اس قدر حقیقی ہے کہ جیسے سچ مچ گولیاں چل رہی ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی دیکھ کر پریشان ہوتا ہے کہ اُس کے عزیز ترین شاگرد رحمان پر اُس کی حالت دیکھ کر بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ووستہ ستار کو خوب معلوم ہے کہ ان دنوں رحمان پر اُس کی حالت دیکھ کر بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ووستہ ستار کو خوب معلوم ہے ان دنوں رحمان کے سر پر انجمن سازی کا بھوت سوار ہے وہ اوروں کے کارخانوں میں بھی جاتا ہے اور وہاں کے کاریگروں کو بھی انجمن سازی کے لیے اُبھارتا رہتا ہے۔ وہ ان پر تقریریں جھاڑتا رہتا ہے کہ انجمن سازی کے بغیر کسی بھی کاریگر کی مالی حالت سدھر جانے کا سوال ہی نہیں۔ اُس کی غریبی اور اُس کا افلاس ختم ہونے کی کوئی امید نہیں۔ اور اب بھی ووستہ ستار کے دم میں رحمان کا کانٹا چبھ رہا ہے اور وہ بے چینی میں زور زور سے حقے کے کش لگانے لگتا ہے ووستہ ستار نے لاکھ چاہا کہ رحمان کو کارخانے سے بے دخل کر دے لیکن کوششوں کے باوجود اُسے الگ نہ کر سکا کیونکہ رحمان اُس کا قابل ترین کاریگر ہے۔ اس کا فن دیکھ کر ہی تو سبھی کارخانے دار اُسے اپنے یہاں کام پر لگانا چاہتے تھے۔ اُس نے ان ہی سوچوں میں اپنے کارخانے کو دیکھا۔۔۔ دور ایک کونے میں فن پاروں کا ڈھیر بے کار پڑا تھا۔ میز، ڈبے، مناظر، شمع دان۔۔۔ سب کچھ مکمل تھے لیکن ان کے خریدار نہ تھے۔ ووستہ ستار کو ایک ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ آخر اُس کا کارخانہ کیسے چل سکے گا۔ بازار سُنسان پڑے ہیں۔ خریدار کوئی نہیں، قرضوں کی بھرمار ہے۔ خام مال واجب لادا ہے، کشتی والے کا اُدھار، آری کش کی اُجرت جس کا تقاضہ وہ بار بار کرتا رہتا ہے۔ یوں بنتا ہے کی جیسے اُس کے پاس ان پیسوں کی سوا اور کوئی آمدنی نہیں۔ مہاجن کا سود باقی ہے اور وہ روزانہ دروازے پر آکر تقاضہ کرتا رہتا ہے۔ حالانکہ اُس کے یہاں میں نے اپنی بیوی کے زیورات بھی گروی رکھے ہوئے ہیں۔ اور یہاں یہ کاریگر لڑتے ہیں روز خرچہ مانگتے ہیں۔

اُسے اپنے فن پاروں سے بھی نفرت ہونے لگی تھی۔ طرح طرح کے ڈیزائن والے خوب صورت فن پارے جو یوں ہی بے کار پڑے تھے۔ مال کی جب کھپت ہی نہ تھی تو کارخانہ چلانے کی تُک کیا تھی۔ ان ہی سوچوں میں غرق وہ ووستہ رحمان کی اُور گھورتا رہتا تھا لیکن رحمان چُپ سادھے ہاتھوں میں اوزار سنبھالے اخروٹ کی لکڑی کو کریدتا اور اس کے اندر چھپے راز کھولتا رہتا تھا۔ ووستہ ستار کو رحمان کی کہی ہوئی ایک بات اچانک یاد آ گئی۔ اُس نے ایک دن کہا تھا۔

"اُستاد۔ ہماری کاریگری کے زوال کے دن شروع ہو چکے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی پسند بدل گئی ہے۔ اب انہیں خوبصورت ڈیزائن نہیں چاہئیں۔ ہماری نقاشی انہیں پسند نہیں۔ یہ اور طرح کے ڈیزائن چاہتے ہیں۔ خوفناک اور ڈراونے۔ پھولوں سے انہیں رغبت نہیں رہی۔ ہمارے ان نازک اوزاروں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ لوگ اور طرح کے ہتھیار چاہتے ہیں کہ جن سے ہمارے اسلاف کی تمام روایات کا صفایا کیا جاسکے جن کی مدد سے ہمارے جیسے فن کار نیست و نابود ہو سکیں۔

"نا ہنجار اور بدزبان" ووستہ ستار نے اچانک کہہ دیا جس پر سبھی شاگرد اس کا منہ دیکھتے رہ گئے تھے۔

"استاد۔ تم کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہے تھے؟" سب سے چھوٹے شاگرد نے کہا اور ہنسنے لگا۔ ووستہ ستار کو غصہ آیا اور اُسے پیٹ ڈالا۔

"تم لوگ کل سے چھٹی کروگے۔ کوئی ضرورت نہیں کام پر آنے کی۔ کل سے میں یہ کارخانہ بند کر رہا ہوں۔ یہاں کوئی کام نہیں ہوگا۔ میں مجبور ہوں۔"

اُستاد کی یہ بات سُن کر سبھی کے سانپ سونگھ گیا۔ وہ لوگ مسلے گئے پھولوں کی طرح اُستاد کے چہرے کو تکنے لگے۔

"ہم کہاں جائیں گے اُستاد؟" ایک اور شاگرد بولا۔ اُس نے تھاپی دونوں ہاتھوں میں زور سے پکڑ رکھی تھی۔

رحمان اب تک یہ سارا تماشا خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اُس سے نہ رہا گیا ور بول پڑا "استاد۔ تم خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کی سوچ رہے ہو۔ ہمارے دکھوں کا یہ کوئی علاج نہیں۔" لیکن ووستہ ستار ڈھیٹ ہو کر بولا

"چلو سب نکل جاؤ۔ ابھی سے چھٹی کر لو۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ اوزار بجنا بند ہوئے۔ شام ہونے کو آئی تھی۔ اور بازار میں معمول کی گہما گہمی شروع ہونے لگی تھی۔ لوگ آجا رہے تھے۔ جس میں کئی ایک تیز گام تھے اور کئی خراماں خراماں جا رہے تھے۔ دکاندار آتے جاتے ہر راہ گیر کو تکتے جا رہے تھے کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا راہی ان کی دکان کے اندر خریدار کی صورت میں داخل ہو جائے۔ بازار میں چھابڑی فروشوں کی پُکار دور دور تک سُنائی دے رہی تھی "ایک آنے میں پاؤ۔ ایک آنے میں پاؤ" ان کے

آگے ٹوکریاں بھر بھر کر سیب اور ناشپاتی رکھے ہوئے تھے۔ لیکن لوگ ٹوکریاں دیکھ کر بھی صرف منہ پر زبان پھیر کر چلے جاتے تھے۔

سبھی شاگرد چلے گئے تھے اور ووستہ استاد کی دکان بند ہو چکی تھی۔ جاتے وقت اُس نے سر اُٹھا کر کسی طرف دیکھا بھی نہیں تھا اور نہ ہی کسی سے علیک سلیک ہوئی تھی۔

اُسے ڈر تھا کہ جس شخص سے بھی وہ دو بول بول دے گا، جھٹ سے وہ دکان بند کرنے کی وجہ پوچھ لے گا۔ اور اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب ہی نہ تھا۔ یا اس وجہ سے جواب دینا نہیں چاہتا تھا کہ اُسے اپنا بھرم کھو جانے کا ڈر تھا۔ چنانچہ اپنی پھٹی پرانی چادر سے سر ڈھکتا ہوا وہ لوگوں کی نظریں بچا کر وہاں سے چل دیا۔ دودھ والے کے پیسے بھی ابھی تک باقی تھے اور روٹی والے کے بھی۔ یہاں تک وہ چھپ چھپا کر کلاش پورہ تک آگیا تھا۔ بار بار اُسے رحمان کی باتیں یاد آرہی تھیں۔

"اُستاد۔ آپ کو میری ہر بات اُس وقت یاد آئے گی جب خود آپ پر بھی ہماری طرح مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔" اور بپتا آن پڑی تھی ان ہی سوچوں میں غرق وہ چلا جا رہا تھا کہ گھر آگیا۔ ابھی گلی میں جانے ہی والا تھا کہ دور سے کسی کی آواز سنائی دی۔

"استاد۔ اے اُستاد۔ بھلا اور کتنے چکر لگواؤ گے مجھ سے۔ پورے دو ماہ سے تمہارے گھر میں سبزی دیتی آرہی ہوں۔" یہ ساگ بیچنے والی تھی۔ اس کی پکار سنتے ہی ووستہ ستار جھٹ سے گھر میں چلا گیا تھا اور ایسا بن گیا تھا کہ جیسے اُس کی آواز سُنی ہی نہ ہو۔ آنگن کے اندر جاتے ہی اُس کا سانس رُک گیا تھا۔ وہاں لکڑی والا کب سے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ بار بار اُس کا نام لے کر آوازیں لگا رہا تھا۔ ووستہ ستار نے چاہا بھی تھا کہ اُلٹے پاؤں لوٹ جاؤں لیکن ایسا نہ کر سکا۔ بھرم تو بہر حال قائم رکھنا تھا۔ چنانچہ نرمی سے بولا

"میں نے تھوڑا سا مال کو ٹھی والوں کے سپُرد کر دیا ہے۔ امید ہے بہت جلد تمہارا حساب بھی پورا کر لوں گا۔ تم تو بہت مدت سے میرے ساتھ کام کرتے رہے ہو۔ آئندہ بھی چلتا رہے گا۔" یوں اُس نے لکڑی والے سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ اور اندر چلا گیا۔

"بس آج کل میں کام تھوڑا ٹھنڈا ہے۔ ورنہ اخروٹ کی لکڑیاں پھونکیں مار مار کر جلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ جلانے کی خاطر گھر میں لکڑیاں بھی نہ تھیں۔ ووستہ ستار پریشان تھا گھر کا کیا کروں۔ اندر آتے ہی ننگ دھڑنگ بچے اُس کی ٹانگوں میں جھول گئے تھے۔ سب کی ایک ہی پکار تھی۔ "لے آئے ہو بابا؟۔۔۔۔"

بچوں کی شوخیاں اُن کی ماں سے بھی برداشت نہ ہوئیں۔ جھلاہٹ میں اُس نے سب کو پیٹ ڈالا۔ اور اب اپنے خاوند کو کوس رہی تھی۔

"گھر کے اندر کچھ لے آتے تو اب تک تمہارے لئے کھانا بھی لائی ہوتی۔" وہ بولی تھی اور اچانک وستہ ستار کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ جب کچھ نہ بن پڑا، خالی پیٹ سو گیا۔ اُسے رحمان کی کہی ہوئی یہ بات پھر ایک بار یاد آئی۔

"استاد۔ جب خود پر آپڑے گی، ہماری حالت جان جاؤ گے۔"

ہمسایوں کے یہاں گھر میں ابھی بڑوں کے قہقہے اور بچوں کی شوخیاں زور شور سے جاری تھیں لیکن وہ ایسے سو گیا تھا کہ جیسے آدھی رات ہو گئی ہو۔ البتہ نیند نہیں آرہی تھی۔ آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔ وہ کروٹیں بدل رہا تھا۔ رہ رہ کر وہ رحمان کو یاد کر رہا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ رحمان عقل کی بات کہہ گیا ہے۔ عمر میں وہ ضرور چھوٹا ہے لیکن دماغ بزرگوں جیسا پایا ہے۔

"ہر گاہے یورپ اور امریکہ کو ہمارے کام سے تھوڑی سی دلچسپی ہوتی، ہمارا کام یوں نہ ٹھپ ہو جاتا۔ یہ لوگ ہم پر صرف حکومت کرنے آئے ہیں اور ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر ہماری ہی محنت کا پھل لوٹ رہے ہیں۔ انہیں تو جنگ سے فرصت نہیں۔ ہمارے بے روزگاری کی فکر کیا کر پائیں گے۔ یہ فقط ایک دوسرے سے لڑتے آرہے ہیں۔ لوگوں کو جنگ کے لیے اکساتے ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے ہم بے کار ہو گئے ہیں۔ ہم پر مہنگائی نازل کر دی گئی ہے۔ ہم چاہتے تو اپنے ہی ملک کے بازاروں میں اپنے مال کی کھپت پیدا کرتے۔ لیکن کون خریدار بن پائے گا جبکہ ہر شخص کی ناؤ منجدھار میں پھنس گئی ہے۔"

وہ ساری رات چھت کو تکتا رہا اور سوچتا رہا۔ رات ختم ہوتے ہی اُس نے علی الصباح بستر چھوڑ دیا اور نئی صبح کو ایک نیا عزم لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ جان گیا تھا کہ جب تک سبھی کاریگر اور کارخانے دار یک جُٹ ہو کر اپنی مشکلوں کا سدِ باب نہ کریں گے، کسی بھی شخص کی مشکل حل نہیں ہو سکے گی۔ ہمیں چاہیئے کہ خود ہی اپنے دکھوں کا علاج ڈھونڈ لیں۔ یہ لوگ غاصب ہیں جو ایک طرف ملکوں کو آپس میں لڑا رہے ہیں اور دوسری اُور ہمارے دوست بن بیٹھے ہیں۔

"میں اب چُپ نہیں رہوں گا۔" اس کے خیالات بدل رہے تھے اور خیالات بدلنے سے اس کے بدن میں نئی طاقت آگئی تھی۔ اور آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک۔

ہردے کول بھارتی

دو آئینوں کے درمیان

مکڑی نے پین سٹینڈ میں کھڑی قلم کی دُم کے آگے چکر کاٹا، دوسرا چکر کاٹا، تیسرا چکر کاٹا اور رُک گئی۔ وہ شاید جال بُننے کی خاطر آس پاس کی ہر چیز کا تعین کر رہی تھی۔ اب کی بار وہ اپنے ہی تانے ہوئے جال پر لٹک گئی اور اسی سے پھسلتی ہوئی نیچے پڑی دوات کے ڈھکن تک آگئی۔ (دوات کی سیاہی کب کی خشک ہو چکی ہے)۔ اور اب مکڑی اسی تار کے سہارے چڑھتی ہوئی قلم کی دُم تک اوپر آگئی اور اوپر آکر کچھ اس انداز سے نیچے دیکھا کہ جیسے اطمینان کرنا چاہتی ہو کہ جال کی بنیادیں مضبوط پڑ رہی ہیں یا نہیں۔ شاید وہ مطمئن تھی کیونکہ اس بار وہ فوراً الٹ کر نیچے آگئی اور یوں پچھلے تار کے متوازی دوسرا تار بھی جُڑ گیا۔

یہ سب میری آنکھوں کے آگے میری ہی میز پر ہو رہا ہے کہ جس کے پیچھے کُرسی کی جگہ ایک قدِ آدم آئینہ رکھا ہے جس میں میری ہی ذات پیوست ہو کر رہ گئی ہے۔

مکڑی پھر ایک بار دوڑتی ہوئی قلم کی نوک تک آگئی اور دوبارہ پھسل کر نیچے چلی گئی۔ جال میں تیسرا تار بھی جُڑ گیا۔ اُسے تو میری موجودگی کا نہ خوف ہے نہ کوئی وسوسہ۔ شاید وہ جانتی ہے کہ میں اب بے ضرر ہو کے رہ گیا ہوں۔ قدِ آدم آئینے میں پیوست میری ذات محض ایک تصویر ہے جو صرف آنکھیں لا سکتی ہے اور بس۔ میز سے ذرا دوری پر بند کھڑکی ہے جس میں فراسٹ گلاس Frost Glass لگا ہے۔ اس میں صرف روشنی کا گذر ہو سکتا ہے دھوپ کا نہیں۔

اور اُس روز بھی یہ کھڑکی اسی طرح بند تھی۔ اور آج ہی کی طرح اس کے بیچ سے روشنی کا گزر ہوتا تھا، دھوپ کی بالکل نہیں۔ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ کہ بند کھڑکی، مکڑی، باہر کی کھلی دھوپ اور اُس کے درمیان کوئی بندھن ضرور ہے، کوئی رشتہ ۔۔۔ اور اس رشتے میں کہیں میرا بھی نام آتا ہے۔ البتہ یہ احساس مجھے اب ہو رہا ہے۔ اُس روز میرے اندر اس قسم کا کوئی احساس نہ تھا کہ جب وہ بلا اجازت میرے کمرے میں یوں در آیا کہ جیسے میری اُس سے بہت پرانی شناسائی ہو۔

مکڑی پھر ایک بار تار کے سہارے قلم کی نوک تک گئی اور وہاں سے لٹکتی ہوئی نیچے آ گئی۔ جال کا ایک اور تار تان دیا گیا تھا۔

"ناراض کیوں ہو رہے ہو؟ اپنی مرضی سے کسی کے گھر نہیں جاتا۔" وہ اندر آتے ہی بول پڑا۔

"پھر کس کی مرضی سے جاتے ہو؟" میرا غصہ کم ہونے لگا تھا۔

"خریداری کی مرضی سے۔" جیسی اُس کی شکل تھی ویسی ہی اُس کی باتیں بھی پُر اسرار تھیں۔

"لیکن مجھے کسی چیز کی حاجت نہیں۔" میں نے مختصر بات کہہ دی۔

"کیوں؟ کیا تم آئینے کی تلاش میں نہیں ہو؟" وہ یوں مسکرا دیا کہ مجھے لگا وہ کھلکھلا کر ہنس بھی دے گا، لیکن ایسا کچھ ہوا نہیں۔ بلکہ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔۔۔ یہ سچ ہے کہ میں آئینے کی تلاش میں تھا۔ قدِ آدم آئینے کی۔ جس میں ایک ہی نظر میں اپنا مکمل وجود دیکھ لیتا۔ اپنا اگلا اور پچھلا عکس۔ وہ مڑ کر جانے لگا لیکن دروازے کے نزدیک رُک گیا اور کہنے لگا۔

"ایک بات کہہ دوں؟"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کسی کا آئینہ جوڑتے مجھے دُکھ ہوتا ہے۔" یہ کہتے ہی وہ فوراً نکل گیا۔ مکڑی پھر ایک بار تار سے لٹکتی ہوئی اوپر گئی اور قلم کی نوک سے واپس پھسل پڑی۔ جال میں ایک تار اور لگ گیا۔ جلد ہی وہ پھر آ گیا۔ اُس نے بغلوں میں دو قد آدم آئینے یوں دبا رکھے تھے کہ وہ جیسے آئینے نہ ہوں بلکہ گتے کے ٹکڑے ہوں۔

"کہاں رکھے جائیں گے؟" اس کا لہجہ اب سراسر کاروباری تھا۔

"کہیں پہ رکھ دو۔ میں بعد میں سجا کر رکھ دوں گا۔" بات ختم کرنے کی غرض سے میں نے کہہ دیا۔

"نہیں پہلے یہ ارادہ باندھ لو کہ آئینے کہاں رکھو گے۔" وہ اصرار کرتے ہوئے بولا

"کیوں؟" تنگ آ کر میں نے کہا۔

"اس لیے کہ میں صرف ایک بار گاہک کے یہاں جاتا ہوں۔ اور میرے بعد کوئی بھی ان کی جگہ تبدیل نہیں کر سکتا۔" وہ اپنے ہر نقطہ پر زور دے کر بولا۔ جیسے مجھ پر ان کی اہمیت واضح کرنا چاہتا ہو۔

"اچھا۔ایک میری دائیں اور دوسرا بائیں طرف رکھ دو۔"

"یہ تو میں جانتا تھا۔" عجیب سے انداز میں وہ بولا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ تم ان کو اپنے دائیں بائیں لگادو گے۔"

"وہ کیسے؟"

"یہی تو ہوتا ہے۔ میرا تجربہ ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

اس کے بعد وہ خاموش رہا۔دونوں آئینے اُس نے بڑی مہارت سے میرے دائیں بائیں کھڑے کر دیئے اور واپس چلا گیا۔ البتہ اُس کے جانے کے بعد ہی مجھے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ وہ جیسے کوئی چیز کمرے سے اٹھا کر لے گیا ہے۔ میں نے سارا کمرہ دیکھ ڈالا۔ ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی۔ لیکن پھر بھی مجھے لگ رہا تھا کہ کوئی کمی ضرور ہے۔ کوئی خالی پن ہے۔

مکڑی پھر ایک بار قلم کی نوک سے پھسل کر نیچے دوات کے ڈھکن تک آگئی اور جال کا ایک اور تار مکمل ہوا۔

دو آئینوں کے درمیان اب میں تھا۔ صرف میں میرا عکس ایک طرف ایک آئینے سے خارج ہو کر دوسرے پر پڑ رہا تھا اور وہاں سے بھی یہی عکس ایک سے دو بن کر خارج ہو رہا تھا۔ پھر یہاں سے چار اور وہاں سے آٹھ بن رہا تھا۔اور واپسی پر وہاں سے سولہ، یہاں سے بتیس اس کے بعد چوسٹھ۔۔۔۔ عکسوں کا لامتناہی سلسلہ۔ صرف اور صرف میرے ہی عکسوں کا سلسلہ کہ جن کا ماخذ بھی میں تھا اور مرکز بھی میں ہی۔ بس میرے گرد بے شمار عکس۔ جس پر میں خوش بھی تھا اور مطمئن بھی۔

لیکن جلد ہی مجھے احساس ہونے لگا کہ آئینے اپنی جگہ بدلتے جا رہے ہیں۔ پہلے مجھے گمان تھا کہ یہ شاید فراش کے چھو جانے سے ہلتے رہتے ہیں۔ لیکن بات وہ نہ تھی۔اور یہ بات میں جان گیا تھا کہ جب وہ دائیں اور بائیں اطراف سے میرے اس قدر نزدیک آگئے تھے کہ دونوں کے بیچ میں میرے لیے مشکل سے ہی جگہ بچ پائی تھی۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ کام ختم کرتے ہی دونوں آئینے واپس اپنی جگہ پر لے جاؤں گا لیکن اس کے مہلت ہی نہ مل سکی۔اب وقت آگیا تھا۔ دونوں آئینے دو اطراف سے اس قدر قریب آچکے تھے کہ میرے کانوں پر دائیں بائیں سے شدید دباؤ بڑھ رہا تھا۔ گھبرا کر میں نے پیچھے کی طرف لڑھکادی اور ایک آئینے سے اپنی کمر لگا کر

دوسرے کو اپنے پاؤں کی مدد سے پیچھے کی طرف ڈھکیلنے کی خاطر زور لگا دیا۔ لیکن اس سے کچھ بھی نہ ہوا۔ آئینے تو سرک گئے اور نہ ہی کوئی ٹوٹ پھوٹ سکا۔ پھر ایک بار میں نے زور لگا دیا، لیکن آئینے اور قریب آ گئے۔ میں نے پھر سے پاؤں کا زور لگانا چاہا اور اچانک ہی آئینے اور قریب آ گئے۔ میں نے پھر سے پاؤں کا زور لگانا چاہا اور اچانک ہی آئینے کی شفاف سطح پر میرا پاؤں پھسل گیا اور یوں میں دو آئینوں کے درمیان پھنس کر رہ گیا۔ میں نے چلانا چاہا، لیکن آواز نہ نکلی۔ کیونکہ اس سے پہلے کہ میری آواز نکلتی میں دونوں کے بیچ میں پس کر رہ گیا تھا۔

---میرے جسم کی حرارت کی بنا پر پیچھے والے آئینے نے میرے لئے تھوڑی جگہ بنالی تھی اور میں اس میں پیوست ہو گیا تھا۔ بالکل ہموار۔ پھر آئینے واپس اپنی اپنی جگہ پر آ گئے تھے اور جب سے اب تک یہ دونوں وہیں کھڑے ہیں۔ بالکل نہیں ملے ہیں---اور میری ذات اب ان ہی میں پیوست ہے اور مقید ہے۔

مکڑی پھر ایک بار لٹکتی ہوئی قلم کی نوک تک آ گئی اور وہاں سے پھسل کر نیچے آ گئی اور یوں جال کا آخری تار مکمل ہوا۔

ہری کرشن کول

دھوپ

دلّی آکر تو پوشہ کُج کو لگا گویا ایک نئی دنیا میں آگئی ہے۔ یہ سوچ کر تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دیکھو یہاں آس پاس میں مسلمانوں کا وجود ہی نہیں۔ ہر طرف اپنے ہی ہندو بھائی ہیں۔ دودھ والا ہندو اور روٹی والا بھی ہندو۔ اور بھگوان نے اُس مچھیرن سے بھی چھٹکارا دلا ہی دیا ہے۔ پوشہ کُج کے لیے بس یہی بات زیادہ خوش آیند تھی۔ "مچھیرن" یعنی پوشہ کُج کی بڑی بہو۔ اُس کی یاد آتے ہی وہ پھر ایک بار کانپ اُٹھی۔ ذرا ذرا سی بات پر چڑیل کی طرح پیچھے پڑنا تو اس کی عادت تھی۔ محلّے میں وہ اُسی ڈائن کی وجہ سے بدنام ہو کر رہ گئے تھے ورنہ ان لوگوں کا نام تک کسی کو معلوم نہ تھا۔ اور بھگوان بھی تو اُس کے لچھن دیکھ کر ہی اُس پر مہربان ہوا ہے۔ ہاں اور کیا؟ گاشا اور صاحب، کہنے کو تو دونوں ایک ہی ماں کے دو بیٹے ہیں۔ صاحب یہاں ٹھاٹھ سے جی رہا ہے اور وہاں بے چارہ دو وقت کے کھانے کو ترس رہا ہے۔ یہ سب اُسی مچھیرن، اُسی کرموں جلی کی بدولت ہے۔

پوشہ کُج نے ٹھان لی کہ اب کی بار وہ گرمیوں میں بھی واپس کشمیر نہیں جائے گی۔

شاید دس بج رہے تھے۔ پوشہ دھوپ لینے کی غرض سے باہر لان میں آگئی تھی جہاں ایک طرف اینٹوں کا فرش تھا اور ایک طرف سبزہ اگایا گیا تھا۔ سبزے کے ایک طرف پھولوں کی کیاریاں بنی تھیں۔ اینٹوں کے فرش پر گملے تھے جن میں بیلیں اگائی گئی تھیں۔ کچھ بیلیں انگور کی بیلوں کی مانند کوارٹر کی دیواروں پر بھی چڑھ آتی تھیں۔

پوشہ کُج کے چھوٹے بیٹے صاحب جی، یعنی سریندر ناتھ کے نام سروجنی نگر میں بڑھیا سا سرکاری کوارٹر الاٹ کیا گیا تھا۔ جس کے گراونڈ فلور میں ڈرائنگ روم، سٹور روم اور کچن تھا۔ کچن میں ایک طرف تھوڑی جگہ خالی بچی تھی جہاں انہوں نے میز اور کرسی لگا کر ڈرائنگ روم سا بنا دیا تھا۔ اوپر والی منزل میں باتھ روم اور لیٹرین کے علاوہ دو عدد بیڈ روم بھی تھے۔ ایک

بیڈروم میں وہ دونوں میاں بیوی سویا کرتے تھے اور ایک میں پوشہ کُج کے لیے چارپائی لگادی گئی تھی۔اس کے علاوہ چھت برساتی بھی تھی۔ سریندر ناتھ تین سال قبل ہی ولایت سے لوٹا تھا۔ ولایت وہ وظیفہ حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خاطر گیا تھا۔ بعد میں وہیں پر ہندوستانی ہائی کمیشن میں ملازم بھی ہوا تھا۔ اب یہاں تبدیل ہو کر آیا تھا۔ اوز بدیشی معاملوں کی وزارت میں کسی اونچے عہدے پر فائض تھا۔ ہزار کے قریب اُس کی تنخواہ تھی۔ شادی تو اس کے ولایت جانے سے پہلے ہی ہو چکی تھی اور پوشہ کُج کو دراصل اسی بات کا افسوس تھا۔ کاش کہ وہ کنوارا ہوتا۔ جانے کتنے رئیس اپنی بیٹیوں کی شادی کی خاطر پوشہ کُج کے پاؤں پڑ رہے ہوتے۔ بہر حال۔ یہ تو قسمت کا پھیر ہی کہلائے گا۔ پوشہ کُج سوچتی لیکن اپنے اس دُکھ کا کسی پر اظہار نہ کرتی۔

لان میں پڑی کرسی پر بیٹھے بیٹھے پوشہ کُج نے اپنے بازوؤں اور ٹانگوں میں خوب دھوپ بھر دی۔ اُسے لگا کہ اُس کی کمر کی ہر ہڈی اور ہر نس جو ابھی تک کشمیر کے جاڑے میں سکڑ رہی تھی، دلی آکر دھوپ کی گرمی سے نرم پڑ گئی ہے۔ اُسے لگا کہ بدن کا رسپہ اچانک ہی دور ہو چکا ہے۔ ایک بار سر اُٹھا کر جو اُس نے کُھلے آسمان کو دیکھا تو اس کا نیلا رنگ من کو بہت بھانے لگا۔ تیسری منزل کی بالکونی میں چھوٹی بہو نے دُھلے ہوئے کپڑے سکھانے کی خاطر اسی پر لٹکادئے تھے۔ یہ دھوپ میں خوب چمک رہے تھے۔

"ولایتی مشین بھی کیا خوب چیز ہے۔ اب دیکھو تو یہ کپڑے کس قدر صاف دُھلے ہیں۔۔۔" وہ اسی سوچ میں تھی کہ کپڑوں میں اُسے چھوٹی بہو کی انگیا بھی لٹکتی نظر آگئی۔ شرم سے اُس کا چہرہ لال ہو گیا۔

"تراہے۔ تراہے۔ جانے پڑوسیوں نے یہ انگیا دیکھ کر کیا کیا باتیں بنائی ہونگی۔" وہ کُرسی سے اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی اور پریشانی کے عالم میں لان میں ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے اُسے ایک اور خیال آگیا۔ خیال آتے ہی اُس نے بہت سارے پھول توڑ کر اپنے آنچل میں جمع کر لئے۔ اُس کا خیال تھا کہ چھوٹی کو ساتھ لے کر مندر جائے گی۔ سُنا ہے یہاں کا برلا مندر دیکھنے لایق ہے۔ اور اس میں وقت بھی کتنا لگے گا۔ زیادہ سے زیادہ آدھ ایک گھنٹہ۔ چنانچہ اب مندر سے ہو آکر کھانا بھی کھایا جائے گا۔ یہ سوچتے ہی وہ اندر گئی۔ آنچل میں سنبھالے ہوئے پھول اس نے میز پر رکھ دئے اور خود کُرسی پر بیٹھ گئی۔

"جانے کب آئے گی یہ نیچے۔ پچھلے ایک گھنٹے سے باتھ روم میں جا بیٹھی ہے۔

بھگوان جانے کیا الٹا بلا اپنے بدن پر ملتی رہتی ہے۔ اور دلی آکر تو یہ اور بھی بے حیا بن گئی ہے۔ ۔۔۔ پھر بھی اُس مچھیرن سے اچھی ہے۔"

دیر بعد باتھ روم کا دروازہ کھولے جانے کی آواز آئی چھوٹی اتراتی ہوئی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اُس نے جمپر اور ساڑی بھی بدل دی تھی۔ بال کھلے تھے۔ کھلے بالوں کے باوجود پوشہ کج کو اس میں نفاست سی دکھائی دی۔ کہاں وہ جو ابھی ابھی گاؤن پہنے دربدر گھوم رہی تھی۔

"ہائے ہائے ماتا جی۔ یہ آپ نے کیا کر دیا ہے؟"

میز پر پڑے پھول دیکھ کر چھوٹی اپنے آپ کو نہ روک سکی اور چلائی۔ اس کو چلاتی دیکھ کر پوشہ کھسیانی سی ہو کر رہ گئی، یہ سوچ کر شاید مجھ سے کوئی بڑی بھول ہوتی ہے۔

"ماتا جی۔ آپ یہ پھول کیوں توڑ لائی ہیں۔ خاص طور سے ہولی ہاکس؟" چھوٹی کو پھول توڑے جانے کا دکھ بھی تھا اور غصہ بھی۔ لیکن اتنی سی بات پر یوں کان سکوڑ کر بات کرنا، پوشہ کج کو بہت ہی برا لگا۔ اُس نے سوچا کہ ایسی زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے۔ یہ تو بس پھولوں کا معاملہ ہے اور اتنی سی بات پر بہو کا اس قدر ناٹک، اور دیکھنا یہاں آکر کیا نخرا دکھا رہی ہے۔ وہاں پر تو مجھے "کاکنی" کہہ کر بلاتی تھی اور یہاں آکر اب "ماتا جی، ہو گئی ہوں۔۔ ٹھینگے کی ماتا جی!!! البتہ اپنا غصہ اپنے ہی من میں رکھ کر دھیمے سے لہجے میں بولی۔

"سوچا تھا مندر جاؤں گی۔"

"تو آپ کو پہلے ہی بولنا چاہیئے تھا۔ یہاں اس لوکلٹی میں کوئی بھی مندر نہیں ہے۔ اور نہ ہی نزدیک میں۔ یہاں تو بس پوری اور اشوکا ہوٹل ہی نزدیک پڑتا ہے۔"

"وہ کیا چیز ہے؟"

"وہ آپ نہیں سمجھیں گی۔ چلئے ہم دھوپ میں بیٹھتے ہیں۔"

بہو کی اس بات پر پوشہ کج کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سوچا کہ فاتر العقل گوو ند جو کی بیٹی کی سمجھ میں بات تو آسکتی ہے اور میری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ کیا سمجھتی ہے یہ اپنے آپ کو۔ مجھے چاہیئے کہ اس کو اسی وقت کھری کھری سُنادوں۔ ورنہ یہ سر چڑھ جائے گی اور مجھے کبھی بھی بولنے نہ دے گی۔ چنانچہ بولی۔

"تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو؟ میں جانتی ہوں یہاں کا برلا مندر بہت مشہور ہے۔ جس کو دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔"

"برلا مندر یہاں سے کافی دور ہے۔ پہلے کناٹ پیلیس جانا ہوتا ہے، پھر گول مارکٹ۔ تب کہیں جاکر برلا مندر آتا ہے۔"

پوشہ کج سمجھ گئی کہ یہ بھی ایک بہانہ ہے۔ پرسوں وہ چھت پر گئی تھی اور مغرب میں اُس نے مندر جیسی کوئی عمارت دیکھ لی تھی جس کا نیلے رنگ کا گُنبد بھی تھا۔ اُس کے دل نے اُسی وقت کہا تھا کہ ہو نہ ہو یہی برلا مندر ہے۔ چنانچہ خم ٹھونک کر وہ بولی۔

"بھلا وہ کون مندر ہے جس کا نیلا گُنبد بھی ہے۔ وہ چھت پر سے نظر آتا ہے۔ مائی سے میں نے پوچھا بھی تھا۔ وہ بولی کہ یہی برلا مندر ہے۔"

"ماتا جی۔ مائی کو کیا معلوم۔ وہ بلڈنگ کوئی مندر یا مسجد نہیں ہے۔ بلکہ پاکستان ایمبیسی ہے۔ یعنی پاکستان کا دفتر۔"

پوشہ کج کو بہو کی یہ بات بالکل ہضم نہ ہوئی۔ یہ مجھے کتنا بے وقوف سمجھتی ہے۔ لیکن جھوٹ کے پاؤں کہاں۔ کہاں کشمیر، ہر طرف جہاں مسلمان ہی مسلمان دکھائی پڑتے ہیں، کوئی وہاں پاکستان کا نام زبان پر لانے کی جُرأت نہیں کر سکتا اور دلی میں پاکستان کا دفتر؟ ہونہہ۔ میری بلّی اور مجھ ہی سے میاؤں۔ یہ بہو مجھے کیا سمجھتی ہے جو بہانے بنا رہی ہے۔ بہر حال نہ تو اُس شخص کا کچھ کیا جا سکتا ہے جو دریا کے اُس پار کھڑا رہ کر گالیاں بک دے اور نہ ہی اُس کا جسے کج بحثی کی لت پڑ جائے۔ سوچا کہ بہو کے ساتھ الجھنے میں آخر میرا ہی نقصان ہے۔ کہیں یہ اُسی پچھیرن کی طرح بپھر گئی تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے گی۔ تب تو میرے لئے وہی "نہ جائے رفتن اور نہ پائے ماندن" والی بات ہو گی۔ اس لئے بہتر ہے کہ چپ سادھ لی جائے۔

دوپہر کے بارہ بج رہے تھے کہ چھوٹی نے سٹو جلادیا اور پھُلکے بنانے لگی۔ سبزی اُس نے صبح پریشر ککر میں بنائی تھی۔ اُسے بھی گرم کر کے میز پر سجادیا اور ساتھ میں دو گلاس پانی بھی رکھ دیا۔ چھوٹی سی پلیٹ میں پیاز کاٹ کر رکھ دئے اور فریج میں سے نیمو نکال کر ان پر نچوڑ لیا۔ پوشہ کج جان گئی تھی کہ اب کھانا کھانے کی تیاریاں ہونے لگی ہیں چنانچہ وہ بولی

"میں نے آج کوئی لنچ ونچ نہیں لینا۔"

"ہائے ہائے۔ کیا آپ بھوکے پیٹ رہیں گی؟"

"نہیں بھوکے کاہے کو رہوں گی۔ پلیٹ وہیں چھوڑ کر میرے لئے اُس چھوٹی سی چلمچی میں روٹیاں رکھ دو۔ میں یہاں فرش پر بیٹھ کر کھاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ اوپر اپنے کمرے میں

چلی گئی۔ کشمیر سے وہ اپنے ساتھ ایک دری لے آئی تھی جس میں اُس کا بستر بندھا تھا۔ چنانچہ وہی دری اُٹھا کر وہ نیچے لے آئی اور فرش پر بچھا کر اُسی پر بیٹھ گئی۔ چھوٹی اُسے دیکھتی رہ گئی لیکن کچھ کیے بغیر ہی چلمچی میں پانچ چھ روٹیاں ڈال کر اُس کے سامنے رکھ دیں۔ کٹوری میں سبزی ڈال دی۔ پوشہ کُج نے پٹی کوٹ کی جیب میں چھوٹا سا تولیہ نکال کر اُس پر سبزی کی کٹوری جمادی اور چلمچی گود میں اٹھا کر مزے سے روٹی کھانے لگی۔

روٹی کھاتے ہی چھوٹی اپنے کمرے میں چلی گئی اور کوئی ایک گھنٹے بعد کپڑے بدل اور بال سنوار کر نیچے آگئی۔

''میں مِس کپور کے یہاں جا رہی ہوں۔ تین بجے تک لوٹوں گی۔''

پوشہ کُج نے سُنا لیکن بولی کچھ نہیں۔ اس کی چپ بھلا چھوٹی کو کیا روکتی۔ اُس نے رسٹ واچ کو ایک نظر دیکھا اور بنا کچھ کہے چلی گئی۔ پوشہ کُج کو بہو کا یہ انداز ایک آنکھ نہ بھایا۔ لیکن پھر سوچا کہ میں بھلا کون ہوتی ہوں اس کو روکنے والی۔ جو من میں آئے کرے۔ میری بلا سے ایک بار پھر وہ دھوپ میں بیٹھ گئی اور دھوپ کی گرمی سے اُس کا من پھر ایک بار پُر سکون ہو گیا۔

''میں اس دھوپ کے واری۔ اگر دیکھا جائے تو دھوپ ہی یہاں کی سب سے بڑی نعمت ہے۔'' وہ ساڑی اوپر کھینچ کر اپنی دائیں ٹانگ کھُجا رہی تھی کہ اچانک اُس کی نظر اپنی پنڈلیوں پر گئی۔ یہ پھٹ گئی تھیں۔

''بُرا ہو وہاں کے جاڑے کا۔ ہاتھ اور پاؤں برباد ہو کے رہ جاتے ہیں۔'' یہ کہتے ہی اُسے اپنے پوتے بٹو کی یاد آگئی۔

''اُف۔ اُس ننھی سی جان کے پاؤں کس قدر خراب ہو گئے ہیں۔ شہو کی وجہ سے پاؤں کے زخموں سے پیپ بہہ رہی ہو گی۔ لاکھ بار میں نے اُس مچھیرن سے کہہ بھی دیا تھا کہ بچے کے پاؤں خراب ہو رہے ہیں۔ اس کو جرابیں اور جوتے پہنایا کر۔ لیکن وہ سُننے والی کہاں دیکھا جائے تو فرکا بوٹ کم مہنگے نہیں پڑتے۔ اور گاشا کی تنخواہ بھی کتنی ہے بڑی مشکل سے گذارہ کر پاتا ہے۔ ابھی تک اپنے لئے اُور کوٹ بھی نہ خرید سکا ہو گا۔ سردی سے مر رہا ہو گا۔ قسمت کی بات ہے، اور کچھ نہیں۔'' وہ آہ بھر کر بولی۔

پوشہ کُج آس پاس کے سارے کوارٹر دیکھتی رہی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ یہاں تو لگتا

ہے کہ کوئی نہیں ہے۔ سبھی مر گئے ہیں۔ ہمسائگی تو یہی وجہ ہے کہ ایک دوسرے سے کم از کم بات چیت ہوتی رہے لیکن یہاں دیکھو۔ کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ ایک دوسرے کے ساتھ جان پہچان ہی نہیں وہ کہاں ادھر کی عورتوں کی ٹی ٹی پی ٹی سمجھ پاتی، پوشہ گجِ سوچنے لگی۔ یہاں کی عورتوں کے نام بھی عجیب ہیں۔ ایک مسز جین ہوتی ہے اور دوسری مسز سُندرم۔ کوئی مسز پرکاش ہے تو کوئی مسز فلاں۔ پاس والے کوارٹر کی اس سردارنی ہی کو لو، میری عمر کی تو اس کی بیٹیاں ہیں جب بھی مسز کھیم سنگھ کہلاتی ہے۔ ان کا کون جانے یہ مسز کیا ہوتا ہے۔

کہنے کو تو دلی اچھی جگہ ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ کچھ بھی نہیں۔

باہر سے سکوٹر کی آواز آئی اور پوشہ گجِ جان گئی کہ صاحب آیا ہوگا۔ ہاں صاحب ہی آیا تھا۔ سکوٹر اندر لا کر اُس نے پوشہ گجِ سے پوچھا "کیوں جی۔ دن میں ٹھیک تھیں نا تم۔"

صاحب اپنے کمرے میں گیا اور جلد ہی لوٹ بھی آیا "کہاں گئی ہے یہ؟" اس نے پوشہ گجِ سے سوال کیا

"وہ تو مسز کپور کے یہاں گئی ہے۔"

"کون مسز کپور؟"

"ارے وہی جو اپنے بالوں کا تماشا بنا کر یہاں آتی ہے۔ وہ پتلی پتلی اور گوری گوری۔"

"کون؟ مِس کپور تو نہیں؟"

"ہاں ہاں۔ وہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔"

"کہاں کہہ رہی ہو ماں!" صاحب قہقہہ مارتا ہوا بولا۔ "یہ مِس کپور کہلاتی ہے یعنی کپور صاحب کی بیٹی اور تم نے مسز کپور کہہ دیا۔ جس کا مطلب ہے کپور صاحب کی بیوی۔"

"میری طرف سے بلا مارو۔ اتنی باریکیاں میں کیا جانوں۔"

"جاننا ہی ہوگا ماں! یہاں رہو گی تو خود بہ خود جان جاؤ گی۔" صاحب نے بات ختم کر دی اور کمرے میں جانے لگا۔ پوشہ گجِ بولی۔

"ایک بات کہوں بیٹے۔ مِس کپور کا اس گھر میں زیادہ آنا جانا ٹھیک نہیں۔ مجھے اس کے لچھن ٹھیک نہیں لگتے۔"

"نہیں ماں یہ بے چاری بہت ہی اچھی ہے۔ پھر بھی ہمیں کیا۔ یہ جو ہے سو ہے ہمیں بس اپنا مطلب دیکھنا ہے۔"

''مطلب ؟''پوشہ کُج حیران رہ گئی۔

''مطلب یہ ہے کہ اس کا باپ آل انڈیا ریڈیو میں بڑا افسر ہے۔ اور چھوٹی وہیں پر نوکری کر رہی ہے۔''

''تم بیوی سے بھی نوکری کرواؤ گے ؟ اتنی بڑی تنخواہ سے بھی تمہارا گذارا نہیں ہوتا ہے کیا؟''

''سوال پیسوں کا نہیں۔ یہ یہاں اکیلی رہ جاتی ہے کم سے کم اس کے لئے بھی شغل رہے گا۔۔۔ تو بھی اگر آمدنی بڑھ جائے، اس میں بُرائی کیا ہے؟ ہمارے بھی تو بہت سارے خرچے ہیں۔ گھر میں ریڈیو ہے ٹی وی نہیں۔ سکوٹر ہے لیکن کار نہیں۔''

''تم میں تو پیسے کی ترشنا ہے۔''پوشہ کُج نے اپنی سمجھ کے مطابق بات پھٹ سے منہ پر کہہ دی۔ لیکن صاحب نے بُرا نہ مانتے ہوئے بات ٹال دی۔ ایسے میں اس کی نظر فرش پر بچھی دری پر گئی اور وہ بولا۔

''یہ پھٹی پرانی دری کس نے بچھائی ہے یہاں ؟''پوشہ کُج کو لگا کہ صاحب ناراض ہو گیا ہے چنانچہ وہ منہ لٹکا کر بولی۔

''یہ میں نے ڈال دی ہے۔''

''مجھ سے میز اور کرسی پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا جاتا۔''

صاحب خاموش رہا۔ لیکن دیر بعد جب چھوٹی آگئی۔ صاحب اُس کے ساتھ مشورہ کرنے لگا۔ مشورہ کرنے کے بعد سبھی نے چائے پی۔ چائے پی کر ٹیکسی منگوائی گئی اور پوشہ کُج کو لے کر وہ چاندنی چوک گئے۔ وہاں انہوں نے اس کے لیے سٹیل کی تھالی، لکڑی کی چوکی، چپل، چکن ویل کی ساڑی اور بھگوان شمبھو کی چھوٹی سی مورتی خرید لائے۔ گھر آکر پوشہ کُج کے لیے اسٹیل کی تھالی میں کھانا پروسا گیا۔

پوشہ کُج ساری رات ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوئی۔ عجیب قسم کے سوالات اس کے ذہن میں آرہے تھے اور پریشان کر رہے تھے۔ تو یہ لوگ اب موٹر کار بھی لا رہے ہیں۔ گوند فاتر کی یہ بیٹی بھی کیا قسمت لے کر آئی ہے۔ چلو پھر بھی یہ اپنے شوہر کے لیے اچھے دن لے کر آئی ہے اور ایک وہ ہے پچھیرن، کر موں جلی، اُس نے تو اپنے شوہر کا کھانا پینا بھی ناپید کر کے چھوڑا ہے۔ کیا معلوم گاشے نے سائیکل خریدی ہو گی یا نہیں۔ بے چارہ کہتا تھا کہ اگر کہیں سے قسطوں پر ہی

سائیکل مل جاتی تو ضرور خرید لاتا۔ رعناواری سے دفتر تک روازنہ پیدل جاتے اُس کی ٹانگوں کا بُرا حال ہوتا ہوگا۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں دلی میں رات کو لحاف اوڑھ کر سویا نہیں جاتا۔ لیکن وہاں کشمیر میں آج بھی کڑاکے کی سردی ہوگی۔ میں صاحب سے چٹھی لکھواؤں گی اُسے یہ تاکید کروں گی کہ دیر تک گھر سے باہر نہ رہا کرے۔ بلا مارے اس جواہر والے ٹیوشن کو بھگوان نہ کرے اگر ایسی ویسی بات ہوگئی تو۔۔۔"

"وہاں چاندنی چوک میں کیا کیا الابلا بک رہی تھی۔ بٹو کی سائز کے کتنے ہی نکر اور بش شرٹ دکانوں میں آویزاں تھے۔ میرے اپنے پیسے ساتھ ہوتے تو ایک جوڑا بٹو کے لیے ضرور خرید لاتی۔۔۔ خیر۔۔۔ اگلی بار جب آؤں گی، نکر اور قمیص کے علاوہ اس کے لیے ہاکی بھی خرید لوں گی۔ البتہ پار والوں کی بچی کے لیے چوڑیاں بھی لینی ہی پڑیں گی اور اُس مچھیرن کے لیے ساڑی، جیسی بھی مل جائے ہونی ہی چاہیئے۔"

"اگر زندہ رہوں گی تو صاحب کے ہوتے ہوئے خوب عیش کروں گی۔ پرسوں کہہ رہا تھا کہ اگلے مہینے تم کو ہردوار لے جاؤں گا ماں۔ ہردوار جانے کا شوق تو مجھ سے زیادہ اُس سورگ باسی کو تھا لیکن مرنے کے بعد بھی اُسے بس شادی پور ہی لے گئے تھے۔ بے چارہ گاشاچھ سو روپے کی تنخواہ میں بھلا کہاں باپ کی تمنائیں پوری کر سکتا تھا۔ صاحب گھر میں ہوتا تو بات ہی الگ تھی۔"

"گویا یہاں بھی مسلمان رہتے ہیں۔ میں بھی جانوں چاندنی چوک میں وہ بُرقعے والیاں کس ٹھاٹھ سے جا رہی تھیں۔ پھر بھی انہیں یہاں رہ کر اپنی جانوں کا کھٹکا ضرور لگا رہتا ہوگا۔ بالکل اسی طرح کا کھٹکا جو ہمیں کشمیر میں لگا رہتا ہے۔ لیکن اگر دیکھا جائے یہ سارا وہم ہی تو ہے۔ کوئی کہے کہ ہم کہاں مارے گئے اُدھر جو اِدھر یہ لوگ مارے جائیں گے۔ البتہ وہم کا علاج۔

ایسے میں صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سمینٹ کے فرش پر کوئی تیز تیز چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد باتھ روم سے پانی کا شور سُنائی دیا۔

"لعنت ہے ایسے پیٹ پر۔" پوشہ کُج خود کلامی میں بولی۔

"من بھر سوکھی دال تو چاولوں کے ساتھ چٹ کر گئی ہے اور اب باتھ روم میں پانی

کے شور سے پورے محلّے کو جگادے گی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ ریڈیو سے اعلان کرواتی۔ اب تو وہیں جا بھی رہی ہے نوکری کے لیے۔"

پو پھٹنے لگی تھی۔ پوشہ کج نے بستر بھی چھوڑ دیا تھا اور نہا دھو کر واپس کمرے میں بھی آگئی تھی۔ جسم کے گرد کمبل لپیٹے شوجی کی مورتی کے سامنے بیٹھی لیلا پڑھ رہی تھی۔ "مہم ناپارم" کا کچھ حصہ زبانی یاد تھا اور وہ بھی دہرادیا۔ پوجا کرنے کے بعد چھت پر چلی گئی تھی تاکہ دھوپ لے سکتی۔ چھت پر بیٹھے بیٹھے اُسے خیال آیا کہ دلّی کا آسمان کافی بڑا ہے۔ کشمیر کی طرح یہاں اونچے پہاڑوں کے بیچ بس تھوڑا سا آسمان نہیں۔ اور اسی کھلے آسمان کا اثر شاید یہاں کے لوگوں پر بھی ہے ان کی نظر بھی کُھلی ہے اور اقبال بھی۔ یہاں کی صفائی اور صاف رہنا دل کو لبھاتا ہے۔۔۔ وہ یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ صاحب کی آواز آئی۔ وہ اسے نیچے بلا رہا تھا۔ چنانچہ پوشہ کج نیچے چلی گئی۔ وہاں میز پر پیالیاں، پلیٹیں، ڈبل روٹی، انڈے اور دیگر کھانے کا سامان قرینے سے لگادیا گیا تھا۔ صاحب ایک کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اُس نے گاؤن پہن رکھا تھا۔ چھوٹی کچن سے چائے دانی اٹھا کر آئی اُس نے بھی گاؤن پہنا تھا اور بالوں میں ڈوری جیسا کوئی لال کپڑا باندھے ہوئے تھی۔ چائے دانی میز پر رکھنے کے بعد وہ فرج کی طرف گئی اور وہاں سے نمکین اور اسٹابری کا مربّہ نکال لائی۔ یہ دونوں چیزیں اُس نے ڈبل روٹی پر لگادیں۔

پوشہ کج نے چائے کے ساتھ دو توسٹ کھائے۔ لیکن وہ دونوں میاں بیوی ٹوسٹوں کے علاوہ انڈے بھی کھاگئے۔ خاص طور سے چھوٹی کو انڈا کھاتے دیکھ کر پوشہ کج کو بٹو کی یاد آئی۔ سوچا کہ وہ بے چارا سچ مچ کمزور تھا۔ کیوں نہ ہو، وہاں اُس بے چارے کی قسمت میں ایک پاؤ دودھ بھی نہیں۔۔۔ وہ مچھیرن کم سے کم بٹو کو ہی میرے ساتھ یہاں آنے کی اجازت دے دیتی تو وہ بھی یہاں آکر انڈے کھاتا اور صحت بنالیتا۔

چائے پیتے ہی صاحب اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور چھوٹی نے جوٹھے برتن چلمچی میں مائی کے دھونے کی خاطر ایک طرف رکھ دئے اور لپکتی ہوئی شوہر کے پیچھے پیچھے اوپر چلی گئی۔ دیر بعد دونوں میاں بیوی کپڑے بدل کر نیچے آگئے۔

اور پوشہ کج دونوں کو گھور کر دیکھتی رہ گئی۔ صاحب نے کہا۔

"میں دفتر جا رہا ہوں اور یہ میرے ساتھ مارکیٹ تک جائے گی۔ وہاں میں اسے میٹ خرید کر دوں گا۔" اتنا کہہ کر صاحب نے اپنا سکوٹر سٹارٹ کیا اور چھوٹی بھی اس کے پیچھے والی

سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنا دایاں بازو شوہر کے کاندھے پر رکھ دیا تھا اور اس سے چمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ موٹر سائیکل پھٹ پھٹ کرتی سڑک پر دوڑتی چلی گئی تھی۔

''کیا معلوم گاشا اپنے لئے بائی سائیکل لایا بھی ہوگا کہ نہیں۔ پچاس ساٹھ روپے تو میں نے بھی بچا کر رکھے ہیں۔ اُس کے اگر کام آجائیں تو ضرور بھجوادوں گی۔

وہ ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ مِس کپور آگئی۔ پوشہ کُج کو نمسکار کہتے ہوئے وہ بولی ''مسز بھان گھر میں ہی ہیں؟'' پوشہ کُج اس قدر تو جان ہی گئی تھی کہ کیا پوچھ رہا ہے۔ چنانچہ وہ بولی ''بازار گئے۔ میٹ لانا۔'' جس پر مِس کپور کی ہنسی چھوٹ گئی پوشہ کُج کو اس کی یہ ہنسی ایک آنکھ نہ بھائی۔ لیکن از روئے مُروت بڑی بے دلی سے بولی۔

''بیٹھو بیٹھو۔ ابھی آئی۔''

لیکن مِس کپور بیٹھی نہیں۔ بلکہ مٹک کر ڈرائننگ روم میں چلی گئی۔ گھر کے اندر وہ اس انداز میں گھُسی تھی کہ جیسے اُس کا اپنا اختیار تھا۔ اندر جاتے ہی وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

''کیا ٹھاٹھ ہے کلموہی کے!!'' اتنا کہہ کر پوشہ کُج نے اپنے جسم کو ایک زور کا بل دیا اور منھ بنا کر باہر دھوپ میں جا نکلی۔ کچھ دیر بعد چھوٹی بھی آگئی۔ پوشہ کُج نے کہہ دیا۔

'بہو۔ اندر مسز کپور تمہارے انتظار میں بیٹھی ہے۔''

''ماتا جی۔ مسز کپور نہیں بلکہ مِس کپور کہنا چاہیئے۔''

''مان لو میں نے مِس کپور ہی کہہ دیا۔ میں نے اسے بات کیا کہہ دی اس پر ہنسنے لگی تھی۔''

''نہیں ماتا جی، یہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ آپ کو ضرور دھوکہ ہوا ہوگا۔'' اتنا کہہ کر وہ ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

پوشہ کُج سوچ رہی تھی کہ بہو نے اس کی بات کا اعتبار نہ کیا۔ اس بات کا اُسے بہت دکھ ہوا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ قصور تو بہر حال اس کا اپنا ہی ہے ناحق کسی کے پھٹے میں ٹانگ اڑا رہی۔ دونوں میاں بیوں تو اس کلموہی پر لٹو ہو رہے ہیں۔ آخر کیوں نہ ہوں اس کے باپ سے ان کی غرض وابستہ ہے۔

''مِس کپور۔۔ ہونہہ۔۔ جانے کتنے مردوں کی دیکھ چکی ہوگی پھِس اور جب بھی بنی پھرتی ہے مِس۔''

دھوپ میں بیٹھے بیٹھے جسم کو گرمی پہنچتے ہی پوشہ کُج کو نیند آنے لگی تھی وہ اونگھنے کا

مزہ ہی لے رہی تھی کہ ڈرائنگ روم سے اچانک قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ اُسے یقین ہوا کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی یہ دونوں بدبخت میرے ہی بارے میں گفتگو کر رہی ہیں اور طنز کر رہی ہیں۔ چنانچہ وہ جان گئی کہ ایسے حالات میں اب یہاں رُکنا مناسب نہیں۔ سفر کا ساتھی اگر مل جائے بس دو چار دن کے اندر اندر واپس چلی جائے گی۔

اور اگر بس چلے یہاں کی ساری دھوپ ٹوکریوں میں بھر بھر کے اپنے ساتھ لے جائے گی۔

افسانہ نگاروں کا تعارف

☆ اختر محی الدین

1928 میں سری نگر کے محلہ بٹہ مالنہ میں پیدا ہوئے۔ کشمیری زبان کے اعلیٰ پائے کے افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے ایک ناول ذوددگ، اور ایک سرف نامہ، 'سلام وامر' بھی لکھا ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں اردو افسانے لکھا کرتے تھے لیکن جلدی ہی کشمیری زبان کی طرف رجوع کیا، جس سے اب تک کشمیری میں لکھتے ہیں۔ 1958 میں ان کے پہلے افسانوی مجموعے کے نام سے ست سنگر، کو ساہتیہ اکادمی کے انعام سے نوازا گیا۔ افسانوں کا ایک اور مجموعہ 'سومنزل' کے نام سے منظر عام پر آگیا ہے، اختر صاحب کشمیری زبان کے پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے کشمیری افسانے کو مقامی رنگ کے ساتھ ساتھ جدید حسیت سے آگاہ کیا۔ زبان علامتی اور اشعارتی ہونے کے باوجود بھی مقامی رنگ لئے ہوئے ہے۔ اختر صاحب کو پدم شری ایوارڈ بھی دیا گیا۔ ریاست کی کئی ایک سرکاری عہدوں پر فائض رہ چکے ہیں۔ جن میں سکریٹری کلچر اکادمی اور ڈپٹی ڈائریکٹر فیلڈ سروے آرگنائیزیشن بھی شامل ہیں۔

وہ 2001 کے جون کے مہینے میں وفات پاگئے۔ ان کی رحلت کے بعد ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ 'سیونائن وَن سیون' بھی چھپ گیا ہے۔

☆ امین کامل

1924 میں ضلع شوپیاں کے ایک گاؤں کاپرن میں پیدا ہوئے۔ کامل صاحب کا شمار کشمیری زبان کے صفِ اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ اعلیٰ پایے کے افسانہ نگار شاعر اور محقق ہیں۔ ان کے شعری مجموعے 'مس ملر، توبہ پردہ، پدس پودزھاے، کے نام سے اب تک شایع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ کتھ منز کتھ، کے نام سے افسانوی مجموعہ اور گیڈ منز گاش، نام کا ناول بھی منظر عام پر آگیا ہے۔ پدس پودزھاے، پر انہیں ساہتیہ اکادمی کے انعام سے بھی نوازا گیا

ہے۔اس کے علاوہ روحانی فلسفہ، ان کی مشہور کتاب ہے جس میں کشمیری صوفی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ کامل صاحب کچھ وقت تک بہ حیثیت استاد ملازمت کرتے رہے بعد میں کلچرل اکادمی میں کشمیری شیرازہ اور سون ادب کے ایڈیٹر ہوگئے۔ اکادمی میں ملازمت کے دوران انہوں نے کئی ایک کتابیں ترتیب دیں۔ آج کل نٹی پورہ سری نگر میں سکونت پذیر ہیں۔

☆ اوتار کرشن رہبر

1932 میں نرپرستان سری نگر میں پیدا ہوئے۔ کشمیری افسانہ نگاروں میں ان کا اپنا مقام ہے۔ افسانے کے علاوہ ڈرامے اور تحقیقی مقالے بھی لکھے۔ تو بُرکھ نامی ان کا افسانوی مجموعہ چھپ چکا ہے۔ کا'شراد یچ تواریخ' ان کی کشمیری ادب پر اہم کتاب ہے اس کتاب پر انہیں کلچرل اکادمی کے انعام سے نوازا گیا۔ کئی ڈرامے سٹیج ہو چکے ہیں۔ ریڈیو کشمیر سے وابستہ رہنے کے بعد 1991 میں رٹائر ہو گئے۔ رہبر کا انداز بیان صاف سادہ اور غیر مبہم ہے۔ افسانوں میں کشمیر کی روایات، تہذیب اور ماحول کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بذات خود سادگی پسند اور صاف ہونے کے اپنے سماج سے بھی اسی سادگی اور صاف دلی کی توقع رکھتے ہیں جواب ممکن نہیں۔ آج کل نئی دلی میں رہ رہے ہیں۔

☆ بشیر اختر

1944 میں گاؤ کدل سری نگر میں پیدا ہوئے۔ کلچر اکادمی میں بہ حیثیت پبلیکیشنز آفسر اور ایڈیٹر شیرازہ وسون ادب فائض ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیری ڈکشنری اور انسائیکلوپیڈیا سے بھی وابستہ ہیں۔ ملازمت کے علاوہ بھی ان کے دو شوق ہیں افسانہ نگاری اور فوٹوگرافی۔ اپنی ملازمت کے دوران انہیں یہ دونوں شوق پورا کرنے کا خوب موقع ملا ہے اور دونوں فنون میں نام کما چکے ہیں۔ اپنی تیس سالہ ملازمت کے دوران افسانے بھی لکھتے رہے اور مضامین بھی لیکن ابھی تک کوئی بھی مجموعہ شائع نہیں کر سکے۔ ان کا افسانہ کشمیری روایات، کردار اور واقعات کے اردگرد سفر کرتا نظر آتا ہے۔ افسانہ نگاری کا ان کا اپنا الگ اسلوب ہے جس میں داستانوی زبان اور روایات کے علاوہ علامتی انداز منفرد ہے۔ آج کل کھریو (پانپور) میں سکونت پذیر ہیں۔

☆ بنسی نردوش

1931 میں محلہ گنپت یار سری نگر میں پیدا ہوئے۔ بال مرایو، ان کا پہلا افسانوی

مجموعہ ہے جس پر انہیں ریاستی کلچرل اکادمی کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ گرداب اور آدم چھ سچھے بدنام' دو اور افسانوی مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ اکھدوران کا ناول ہے۔ نردوش کی زبان سلیس اور دلچسپ ہے۔ ریڈیو کشمیر کی ملازمت سے رٹائیر ہونے کے بعد آج کل جانی پورہ جموں میں رہ رہے ہیں۔

(بنسی نردوش کا دیہانت اگست 2001 میں ہو گیا: مترجم)

☆ تاج بیگم رینزو

1931 میں سری نگر میں پیدا ہوئیں۔ ان کے شوہر حاجی غلام رسول رینزو خود بھی صاحب کتاب ادیب ہیں[1] جو ریاست جموں و کشمیر کے سیاسی وانتظامی افق پر کئی برس تک چھائے رہے۔ چنانچہ خاوند کی صحبت اور ریڈیو کی ملازمت نے محترمہ تاج بیگم کی ادبی کاوشوں کو مہمیز کیا۔ محترمہ خود بھی سرگرم سیاسی کارکن رہی ہیں۔ خواتین میں پہلی افسانہ نگار ہیں کہ جن کا پہلا افسانوی مجموعہ "الاؤ" کے نام سے چھپ گیا۔ خاتون ہونے کے ناطے خواتین کی نفسیات خوب سمجھتی ہیں۔

([1] رینزو صاحب تھے۔ اب نہیں ہیں۔ حال ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مترجم)

☆ دیپک کول

1932 میں مہاراج گنج سری نگر میں پیدا ہوئے۔ اصل نام موتی لال کول ہے۔ ریڈیو کشمیر سری نگر سے بہت دنوں تک منسلک رہے اور اس کے بعد مرکزی حکومت کے مختلف اداروں میں ملازمت کرتے رہے۔ بہت عرصے سے دلی ہی میں سکونت پذیر ہیں۔ شاید لکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

☆ دینا ناتھ نادم

شبش یار سری نگر میں 1916 میں پیدا ہوئے اور 1988 میں آنجہانی ہو گئے۔ کشمیری زبان کے نامور شاعر ہیں۔ پہلے اردو میں لکھتے تھے۔ 1940 میں کشمیری کی طرف رجوع کیا۔ 1952 میں لکھا گیا ان کا اوپیرا "لومبر یمبر زل" جو صرف ایک بار سٹیج ہوا۔ سالوں گذرنے کے باوجود بھی لوگوں کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ نادم صاحب اشتراکی ذہن کے مالک تھے۔ چنانچہ شاعری کے علاوہ ان کا لکھا گیا افسانہ[1] 'جوابی کارڈ' بھی اسی موضوع پر محیط ہے۔ 1970 میں انہیں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ دیا گیا۔ ان کی کتاب شہلی کُل پر انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا

ہے۔ شعبۂ تعلیم سے وابستہ تھے اور ریاستی قانون ساز کونسل کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔
(1 واحد افسانہ۔ مترجم)

☆ رتن لال شانت

1938 میں بڈی یار بالا سری نگر میں پیدا ہوئے۔ شروع میں ہندی میں لکھتے تھے اور بعد میں ہندی کے ساتھ ساتھ کشمیری میں لکھتے رہے۔ افسانوں اور ڈراموں کے علاوہ تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں ۔ان کی کہانیوں کا مجموعہ اچھر والن پیٹھ کوہ، چھپ چکا ہے۔ شانت کے افسانے زبان اور محاورے کی نسبت اہم سمجھے جاتے ہیں ۔ ہندی کے اُستاد ہیں۔ سہ لسانی پروجکٹ میں بطور ایڈیٹر بھی کام کیا ہے۔ آج کل سبھاش نگر جموں میں قیام ہے۔

☆ رسول پونپر

1939 میں جن پوری بجبہاڑہ میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں نام پا چکے ہیں اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی۔ افسانوں کا ایک مجموعہ بھی چھپا ہے۔ اس کے علاوہ راجندر سنگھ بیدی کے مشہور اردو ناول، ایک چادر میلی سی، کا کشمیری ترجمہ بھی کیا ہے۔ کلچر اکادمی سے بطور ایڈیٹر رٹائر ہو گئے ہیں۔

☆ سوم ناتھ زُتشی

محلہ رگھوناتھ مندر سری نگر میں 1923 میں پیدا ہوئے ۔ کشمیری زبان کے پہلے افسانے پیلہ پھول گاش کے مصنف ہیں۔ افسانے کے علاوہ ڈرامے بھی لکھے ہیں ستمبر 1996 میں انتقال کر گئے۔

☆ شمس الدین شمیم

1949 میں کرالہ کھوڈ سری نگر میں پیدا ہوئے۔ اردو میں ایک افسانوی مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ ملازمت کی ابتدا محکمۂ تعلیم سے کی اور آج کل دوردرشن سری نگر کے نیوز یونٹ سے وابستہ ہیں۔ آج کل برزلہ سری نگر میں قیام ہے۔

☆ شیام لال سادھو

محلہ پورہ سری نگر میں 1917 کو پیدا ہوئے۔ انگریزی کے استاد تھے انگریزی میں لکھی

گئی کئی کتابوں کے کشمیری میں ترجمے کئے جس پر کلچر اکادمی کے علاوہ وزارت ثقافت سے انعام بھی حاصل کر چکے ہیں۔

☆ صوفی غلام محمد

1930 میں بُچھوارہ سری نگر میں پیدا ہوئے۔ کشمیر کے مشہور صحافی ہیں۔ کشمیری زبان میں افسانوں کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں۔ روزنامہ سری نگر ٹائمز کے مدیر اور مالک ہیں۔

☆ عزیز ہارون

1922 میں بربر شاہ سری نگر میں پیدا ہوئے۔ کشمیری زبان کے اولین نثر نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ سرگرم سیاسی اور سماجی کارکن رہ چکے ہیں۔ کئی ایک روسی افسانوں کا کشمیری میں ترجمہ کیا ہے۔

☆ علی محمد لون

1927 میں درگجن سری نگر میں پیدا ہوئے اور دسمبر 1987 میں سڑک کے ایک حادثے میں ان کا انتقال ہوا۔ کشمیری زبان کے مشہور اور مقبول ڈرامانویس تھے۔ افسانے اور ناول بھی لکھے ہیں۔ انہیں ان کے ڈرامہ 'شیا' پر ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ لون صاحب نے ریڈیو کشمیر میں بطور اسسٹینٹ پروڈیوسر بھی کام کیا ہے اور بعد میں کلچر اکادمی میں بہ حیثیت ڈپٹی سیکرٹری تعینات ہوئے۔ گورکی کے مشہور ناول 'The Mother' کا کشمیری زبان میں ترجمہ کیا جو کافی سراہا گیا۔

☆ غلام رسول سنتوشی

چنکرال محلہ سری نگر میں 1929 میں پیدا ہوئے۔ مُلک کے نامور مصوروں میں ان کا شُمار ہوتا ہے۔ آرٹ کے علاوہ ادب پر بھی کئی انعام حاصل کر چکے ہیں۔ نثر اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ کشمیر کی پرانی ثقافت اور تہذیب کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ اپنے کو قلم اور مو قلم دونوں کو ان ہی روایات کا تابع بنالیا۔ 10 مارچ 1997 کو انتقال ہوا۔

☆ غلام نبی بابا

1927 میں نوہٹہ سری نگر میں پیدا ہوئے۔ بہت عرصے سے افسانے لکھ رہے ہیں۔

ریڈیو کے منجھے ہوئے آرٹسٹ ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے۔

☆ غلام نبی شاکر

1923 میں ہارون سری نگر میں پیدا ہوئے۔ پبلک ورکس محکمے میں ملازم تھے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے۔

☆ فاروق مسعودی

1950 میں فتح کدل سری نگر میں پیدا ہوئے۔ بہت کم مدت تک کشمیری زبان میں افسانے لکھتے رہے لیکن جلد ہی افسانہ نگاروں میں نام پیدا کرلیا۔ افسانہ نگاری میں ان کا اپنا اسلوب ہے۔ آج کل مشرقی وسطی میں ہیں جہاں ٹیلی ویژن سے وابستہ ہیں اور اسی کے لیے سیریل لکھتے ہیں۔

☆ محمد زمان آزردہ

1945 میں امرتسر میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد بغرض تجارت عارضی طور مقیم تھے۔ پہلے اردو میں لکھتے تھے کشمیری میں ان کی تین عدد 'اِسے' کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے ایک پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ اردو میں ان کی درجن بھر کتابیں ہیں۔ اردو انگریزی کی کئی کتابوں کے کشمیری تراجم بھی شائع ہوئے ہیں۔ مشہور اردو مرثیہ گو شاعر مرزا دبیر کی Thesis پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ افسانے میں ان کے کردار عام زندگی سے مستعار ہیں۔ ملازمت کئی اور محکموں میں کی لیکن 1927 سے کشمیر یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے آج کل شعبہ اردو کے انچارج ہیں۔ حسن آباد سری نگر میں آبائی گھر میں رہتے ہیں۔

☆ نور محمد روشن

خانیار سری نگر میں 1919 کو پیدا ہوئے۔ شاعر اور نثر نگار ہیں۔ ریڈیو کے علاوہ لالہ رُخ پبلیکیشنز سری نگر سے بھی وابستہ رہے۔ اب تجارت کرتے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ ڈرامے بھی لکھے۔

☆ ہردے کول بھارتی

1937 میں سوپور کشمیر میں پیدا ہوئے۔ کشمیری زبان کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔

اور شاید پہلے فری لانس رائٹر کہ جنہوں نے ریڈیو کی ملازمت کو تیاگ کر قلم کو ہی اپنا پیشہ بنالیا۔ اردو اور ہندی میں بھی لکھتے ہیں۔ ریڈیو۔ ٹی وی، سٹیج اور اخبار سے وابستہ ہر موضوع پر دسترس حاصل ہے۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ چھپ چکا ہے۔ افسانے میں جدیدیت کے علمبردار ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے موضوعات عام قاری کے لیے قدرے پیچیدہ لیکن کافی غور طلب لگتے ہیں۔ آج کل دلی میں مقیم ہیں۔

☆ ہری کرشن کول

1924 میں سری نگر میں پیدا ہوئے۔ ہندی سے کشمیری کی طرف رجوع کیا اور اب کشمیری کے مقبول افسانہ نگار ہو گئے۔ ان کے افسانے محاورے اور زبان کے لحاظ سے عام قاری کے لیے بہت ہی مسحور کن ہیں۔ حالانکہ موضوع کے اعتبار سے وہ ان کی ذہنی سطح سے قدرے اوپر ہیں۔ افسانوں کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ انہیں ان کی کتاب، یتھ راز دانے، پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ ریڈیو اور اسٹیج کے لیے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ پیشے سے اُستاد تھے اب رٹائر ہو چکے ہیں۔ اب دلی میں رہ رہے ہیں۔

☆☆☆

Laser Type setting at Graphic Printer, Mayur Vihar Phase I New Delhi-91
Printed at Shivam Offset Press, A-12/1 Naraina Indl. Area, Phase-I, New Delhi-110 028

KASHMIR AFSANAY

By

Prof. Zaman Azurdah

"کشمیری افسانے" 24 نمائندہ کشمیری کہانیوں کا انتخاب ہے جسے محمد زمان آزردہ نے مرتب کیا ہے۔ دنیا کی دیگر اہم زبانوں کی طرح کشمیری زبان میں بھی داستان اور لوک کہانیوں کی روایات ازمنہ قدیم ہی سے چلی آرہی ہیں۔ کشمیری افسانے کا سفر اگرچہ اشتراکی انقلاب کے زیر اثر شروع ہوا تھا لیکن کشمیری مزاج، تہذیبی اقدار اور سماجی رکھ رکھاؤ کے تحت یہاں کے افسانے نے مانگے کا چولا جلد ہی اتار پھینکا اور اختر محی الدین نے پہلی بار اس کو خالص کشمیری ملبوسات میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ISBN 81-237-4176-6

قیمت: 70.00

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

